قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر، ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔



وہ میرے چہرے پر بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔اس کی سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں عجیب طرح کی سرمستی کے علاوہ گہرائی تھی۔ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی، اس کی بھوئیں ہلکی ہلکی کانپ رہی تھیں۔

''یہ سب کچھ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ کمپنی ابھی میں ختم نہیں کرنا چاہتا، ابھی بہت سارا کام پڑا ہے۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ مجھ سے زیادہ خود کلامی کر رہا ہو۔

''کیا وہ کمپنی ختم ہونے جا رہی ہے؟'' میں نے پھر پوچھا تو وہ سختی سے بولا۔

''ابھی تک کوئی ایسا پیدا نہیں ہو سکا جو اسے ختم کر سکے اور نہ ہی میں پیدا ہونے دوں گا۔''

''تو پھر تم مجھے یہ کیوں بتا رہے ہو؟'' میں نے الجھتے ہوئے پوچھا تو وہ نرم لہجے میں بولا۔

''بات یہ ہے جمال کہ......''

''تم میرے نام سے واقف ہو؟'' میں نے تیزی سے پوچھا تو وہ ہنس کر بولا۔

''ہاں، جب تم برطانیہ پہنچے تھے، میں تب سے جانتا ہوں کہ تم یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا، پھر کہتا چلا گیا۔ ''ہاں تو جمال، میں تمہیں آفر دے رہا ہوں، تم میرے ساتھ شامل ہو جاؤ، اس کمپنی کا کوئی دفتر نہیں، کہیں آنا جانا نہیں، کوئی عہدہ نہیں، سیلری تم جتنی چاہو، اتنی ملتی رہے گی۔''

''یہ پہیلی ہے، بجھارت ہے یا......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات ٹوک کر بولا۔

''وارننگ بھی سمجھ سکتے ہو۔''

''اور تمہیں پتہ ہو گا کہ میں وارننگ دینے والوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''جانتا ہوں، لیکن ندی نالوں میں شکار پکڑنا بہت آسان ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی کامیابی کا مطلب یہ نہیں کہ تم سمندر میں شکار کرو اور تم کچھ حاصل کر لو، ایسا نہیں ہے، سمندر میں وہیل، شارک اور نہ جانے کیا کچھ ہوتا ہے، نجانے تم کب شکار ہو جاؤ، تمہیں خود بھی پتہ نہ چلے۔'' اس بار وہ غراتے ہوئے بولا تھا۔

''سوچنے پر یا خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے مسٹر......'' اتنا کہہ کر میں جان بوجھ کر رک گیا۔

''تم مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہو۔'' اس نے کہا۔

''اور میں تم سے پوچھنا چاہوں گا کہ تم مجھے آفر کیوں دے رہے ہو؟''

''ہاں، یہ کام کی بات کی ہے تم نے، انڈر ورلڈ میں تمہارا نام بہت سنا ہے خاص طور پر بھارت میں، یہ میں جانتا ہوں کہ تم کام کے بندے ہو، کام کرو۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا۔

''کیسا کام؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''وہی جو تم نے اپنے ملک میں کیا اور بھارت میں جسپال نے، ویسا ہی؟'' اس نے کہا تو میں سمجھ گیا یہ بندہ کون ہو سکتا ہے۔اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ بولا۔

''میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں، اس لیے میں تم تک پہنچا ہوں، میں یہاں تمہارے سامنے ہوں، اس سے اندازہ لگا لو کہ میں تمہیں کتنی اہمیت دیتا ہوں۔ ورنہ تم جتنا وقت بھی لگے رہتے مجھ تک نہیں پہنچ سکتے تھے، یہاں تک کہ تمہاری موت کہیں ہو جاتی۔''

''جاؤ، اب تم ہو جاؤ، میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔ میں تمہیں آفر کرتا ہوں کہ تم جب چاہے مجھے موت

کے گھاٹ اتار دو۔'' میں نے اسے چیلنج دے دیا
''تم بہت پچھتاؤ گے۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔
''ابھی تم بچو، تم نشانے پر ہو، جہاں کہو، وہیں گولی لگ جائے گی، بولو۔'' میں نے کہا تو اس نے گھوم کر دیکھا، ڈیورا، بینچ پر یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے سو رہی ہو۔ تانی کے ہاتھ میں پسٹل تھا جو اس نے گود میں رکھ کر نال اس شخص کی طرف کی ہوئی تھی، جو میرے پاس کھڑا تھا۔
''بہت اچھا، مجھے تمہارا انداز پسند آیا، لیکن تم نہیں جانتے کہ اس کے گرد ایک مزید گھیرا بھی ہے، جو میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''تب تک تم ختم ہو چکے ہو گے، جب تک وہ گھیرا تنگ ہوگا، اس گھیرے کا بندوبست بھی ہے میرے پاس، اب کیا خیال ہے؟''
''میری آفر اب بھی وہی ہے؟'' اس نے کسی خوف کے بغیر کہا، پھر چند لمحوں بعد بولا۔
''مجھے پورا یقین ہے کہ تم میری آفر قبول کرو گے۔''
''تم جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں، تم میرے سامنے ہو اور میں تمہیں ابھی ختم کر سکتا ہوں لیکن جاؤ، میں نے تمہیں چھوڑا تاکہ پھر تلاش کر سکوں، اگر میں نے تمہیں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر تلاش کر لیا تو پھر تم میری مانو گے، نہ کر سکا تو میں تمہاری مانوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔
اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ اسے فیصلہ کرنے میں چند لمحے لگ گئے۔ پھر اس نے ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر اس کے ساتھ گلے ملا۔ یہی وقت تھا، جب میں نے اپنا کام

کر دیا۔ میں اس سے الگ ہوا اور اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چند لمحے الجھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھتا رہا، پھر چل دیا۔ ڈیورا ویسے ہی بیٹھی رہی تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھا تو تانی نے اسے ایک طرف جانے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ جب وہ کافی دور چلا گیا تو ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ ڈیورا وہیں بینچ پر بیٹھی رہی۔

''مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ جو ڈیورا کو ساتھ لایا ہے، اس میں ضرور کوئی بات ہے۔'' تانی نے تیز تیز چلتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

''یہ پسٹل کہاں سے آیا؟''

''ڈیورا کا تھا۔ سالی پوری تیاری سے آئی تھی، میں نے بھی صرف ایک سوئی سے کام لیا۔ اب سوئے گی شام تک گہری نیند۔'' اس نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ میں سوچنے لگا، اگر اس وقت میرے ساتھ ایک عام سی لڑکی ہوتی، جس نے تربیت نہ لی ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟'' ہم دونوں وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

☆......☆......☆

صبح ناشتے کے بعد سے ہرپریت کور کے کمرے میں محفل لگی ہوئی تھی۔ بانیتا کور بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی، نوتن کور اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، سندیپ کور ایک صوفے پر نیم دراز تھی اور جسپال ایک کرسی پر بیٹھا ان سب کی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔ اس وقت موضوع یہی تھا کہ وہ ہرپریت کے ساتھ کتنی محبت کرتا ہے۔

''میں اس کا کیا جواب دوں، یہ سوال ہی غلط ہے۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔

''لیکن سوال تو ہے نا؟ جو بھی جواب بنے وہ دو۔'' بانیتا کور نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دیکھو، تم لوگوں نے جو کچھ کھانا پینا ہے، میں وہ لادیتا ہوں، اس کے علاوہ جو چاہتی ہو، وہ کر دیتا ہوں لیکن......'' اس نے کہنا چاہا تو بانیتا تیزی سے بولی۔

''دیکھا ہرپریت، میں نے کہا تھا نا کہ یہ اس سوال کا جواب نہیں دے گا، اب خود ہی دیکھ لو۔ میری بات بالکل ٹھیک ہے کہ یہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔''

''بانیتا، یہ مذاق نہیں بدگمانی ہوگی، ایسا مذاق......'' اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہنا چاہا تو ہرپریت بولی۔

''جسی! اسے کہنے دو، میں تو جانتی ہوں نا تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔''

''اُوئے جا اُوئے، سارے سسپنس کا بیڑا غرق کر دیا ہے تو نے۔ میں تو......'' بانیتا نے کہنا چاہا تو ہرپریت کور تیزی سے بولی۔

''دیکھی نہیں ہو جسی کا چہرہ کیسا ہو گیا ہے۔''

''چل کوئی اور بات کرتے ہیں۔ یار اب تو موضوع ہی ختم ہو گئے ہیں، ایک ہفتہ ہو گیا، گھر میں پڑے باتیں ہی کر رہے ہیں۔'' بانیتا نے اُکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

''پھر چونک کر بولی۔

''وہ انوجیت آ گیا ہے کہ نہیں؟''

''بتایا تو ہے کہ وہ آ گیا ہے اور اپنے کمرے میں پڑا سو رہا ہے۔'' ہرپریت کور نے بتایا۔

''وہ کب جاگے گا یار؟'' وہ پھر اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

''آ جائے گا ابھی کچھ دیر میں۔'' جسپال نے کہا۔

''اچھا، اسے بتا دینا کہ وہ کسی سے نہ ملے، جب تک میں اس سے جی بھر کے باتیں نہ کر لوں۔'' بانیتا کور نے کہا۔

''وہ میں نے اسے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اپنی آمد کے بارے میں ابھی نہ بتائے، اس کا فون بند ہے اور ایک بات اور ہے۔'' ہرپریت کور نے کہا پھر لمحہ بھر

ُرک کر بولی۔

”تیری شادی نہ کرادوں انوجیت کے ساتھ؟“

اس پر سبھی ایک دم سے ہنس دیئے۔ تبھی بانیتا کور بولی۔

”بس پھر جہیز میں کیا آئے گا، یہ تم جانتی ہو۔“

وہ اسی بات پر ہنسنے لگے۔ ایسے میں انوجیت وہاں آ گیا۔ جسے دیکھ کر بھی خوش ہو گئے۔ وہ سب کو یوں بے تکلفانہ انداز میں بیٹھے دیکھ کر حیرت سے بولا۔

”یہاں تو اتنی اچھی محفل لگی ہوئی ہے، میں ایویں خواہ مخواہ سوتا رہا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ تبھی بانیتا کور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”انوجیت! یہ تو بس دل بہلانے کے بہانے ہیں، اس کے علاوہ اور کریں بھی کیا؟ تم سناؤ، کیا ہو رہا ہے چندی گڑھ میں۔“

”بس حکومت بن گئی ہے اور ہم حکومت میں آ گئے ہیں۔ اب وزیر مشیر بننے کے لیے جوڑ توڑ عروج پر ہے۔ بڑی مشکل سے یہ دو دن نکال کر آیا ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن جو ہم پوچھنا چاہ رہے ہیں، اس کے بارے میں بتاؤ، کیا سوچا جا رہا ہے؟“ بانیتا کور نے پوچھا۔

”اگر تم لوگ یہ سوچو کہ کوئی پکڑ دھکڑ ہو گی، اسے بھول جاؤ، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ انہیں یہ پتہ چل چکا ہے کہ اگر وہ تم لوگوں کو ماریں گے تو انہیں بھی مرنا ہوگا۔“ انوجیت نے کہا تو بانیتا کور نے پوچھا۔

”کیا تمہاری بات ہوئی ہے؟“

”ہاں، میرے سمیت چند لوگوں کی۔ رتن دیپ سنگھ بھی تھے اس میٹنگ میں اور ”را“ والے بھی۔ کون کس خفیہ ایجنسی سے تعلق رکھتا تھا، میں نہیں جانتا لیکن بات ہو گئی اور انہیں باور کرا دیا کہ اب نہیں۔“ انوجیت کے اپنے لہجے میں کافی حد تک گرمی آ گئی تھی۔

”کیا تم اس ملاقات کی روداد بتا سکتے ہو؟“ اچانک جسپال نے پوچھا تو وہ بولا۔

”کیوں نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا اور پھر کہتا ہی چلا گیا۔ ”انہوں نے تم لوگوں پر الزام لگایا، میں الزام کی بات کر رہا ہوں، تصدیق نہیں کہ اشوک مہرہ، ہرنیت سنگھ وغیرہ کو تم لوگوں نے مارا ہے۔ اس کے علاوہ وہ پرانی باتیں کرتے رہے۔ وہ شک اس لیے کر رہے تھے کہ امرتسر میں تم لوگوں کی ہوٹل کے باہر تصویریں بن گئی تھیں۔ یہی جو ہماری کمزوری تھی، اسے ہی رتن دیپ سنگھ نے پکڑ لیا۔ آخر اتنا اہتمام کیوں، مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا، اس کا ذمے دار کون؟ پھر جالندھر فارم پر قاتلانہ حملہ کیوں؟ کیا ہم غدار ہیں؟ بہرحال چار پانچ گھنٹوں کی طویل بحث کے بعد اس کا نتیجہ نکل آیا۔“

”کیسا نتیجہ؟“ بانیتا کور نے پوچھا۔

”یہی کہ تم لوگوں نے بھی زیادتی کی۔ دوسری جانب سے بھی ہوئی۔ طے یہ پایا کہ اب اگر کوئی معاملہ ہو، ثابت ہو تو پھر کوئی کارروائی کی جائے۔ ورنہ اب ہم خاموش نہیں رہیں گے۔ کمیشن بن جائیں گے، پھر جو سزاوار ہوگا، اسے سزا دی جائے گی۔“

”مطلب معاملہ رفع دفع ہو گیا۔“ جسپال نے سکون سے کہا تو انوجیت بولا۔

”ہاں، ہو تو گیا ہے فی الحال، لیکن تمہیں پتہ ہے یہ خفیہ ایجنسیوں والے موقعہ کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ اب انہیں ثبوت اکٹھا کرنا ہوں گے۔ اگر آئندہ آنے والے دنوں میں کوئی ثبوت نہ ملے تو کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ اور نہ ہی کوئی گرفتاری ہوگی۔“

”اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ بانیتا کور نے پوچھا۔

"کچھ عرصہ انتظار، تم لوگ جہاں رہو۔ بلدیو سنگھ اور اس کے ساتھی اپنے گھروں میں جائیں۔ کچھ عرصہ تک ان سے رابطہ بالکل نہ رہے اور وہ بھی محتاط رہیں کہ ان کی نگرانی بہر حال ہو گی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ سرہلاتی ہوئی بولی تو چند لمحوں کے لیے ان میں خاموشی چھا گئی۔ تبھی انوجیت سنگھ نے کہا۔

"ممبر بننے کے بعد پہلی دفعہ اوگی پنڈ آیا ہوں۔ میرے یہ دو دن تو لوگوں سے ملنے ملانے میں گزر جائیں گے۔ اب شاید میں آپ کو وقت نہ دے سکوں۔"

"ہاں ایسا ہوتا ہے۔ میں بہرحال آج ہی واپس امرتسر چلی جاؤں گی۔ میرے ساتھ رتن کور بھی جائے گی۔" بانیتا کور نے سوچتے ہوئے کہا، یوں وہ مختلف باتوں میں کھو گئے کہ آئندہ انہیں کیا کرنا ہو گا۔

☆......☆......☆

لندن کی وہ صبح کہر میں لپٹی ہوئی تھی۔ کب بارش آ جائے، اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ موسمی حالات بتانے والوں نے بارش کی پیش گوئی کی تھی۔ اس وقت میں اور جنید لندن کے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ یہ لندن کا پرانا علاقہ تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ "گاڈ فادر" اسی علاقے میں موجود ہے، کس گھر میں ہے اس کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ اصل میں جب ہم لاہور سے نکلنے لگے تھے تو یہ طے تھا کہ لندن اور اس کے علاقے میرے لیے اجنبی ہیں۔ زمینی حقائق کے بارے میں جاننا، آدھی جنگ جیت جانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اروند سنگھ نے چلتے وقت مجھے ایک ایسی ڈیوائس دی تھی، جو دیکھنے میں ذرا سی تھی لیکن اسے کسی بھی انسانی جسم سے چپکا دیا جائے تو یوں دکھائی دیتا تھا، جیسے تل ہو۔ ایک بار چپک جانے کے بعد وہ اترتی نہیں تھی۔ اس نے میرے، جنید اور مہوش کے وہ لگا دی۔ تاکہ ہم کہیں آگے پیچھے بھی ہو جائیں تو گم نہیں ہو سکتے تھے۔ حالات کے بارے میں تو پتہ نہیں تھا اور ہم ایسے دشمن کی تلاش میں نکلے تھے، جس کے بارے میں پتہ ہی نہیں تھا۔ ہمارے پاس صرف ایک فون نمبر تھا۔ میں نے وہ ڈیوائس ڈیورا کے ساتھ بھی لگا دی۔ اس کے بارے میں پتہ چلتا رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ میرے لیے بہت بڑا ذریعہ بن گئی تھی۔ مجھے تو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک خود میرے سامنے آ جائے گا، یہ اس کی خود اعتمادی کی انتہا تھی۔ میں چاہتا تو اسی وقت بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن ابھی میں پوری طرح کنفرم نہیں تھا، دوسرا میں اس کے کام کے طریقے کار کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور تیسرا وہ جو خود میرے پاس آفر لے کر آ گیا تھا، اس نے ایسا کیوں کیا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس کا دشمن ہوں، اسے نقصان پہنچا چکا ہوں۔ اس کے پیچھے ضرور کچھ تھا، یہ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر یہ سب میرے ذہن میں تھا، اس وقت میرا رویہ ایسا کیوں ہو گیا تھا، مجھے خود نہیں احساس تھا۔ دوسرا مجھے یہ زعم تھا کہ لندن میں جو میرے رابطے تھے، جنہوں نے مجھے اپنی نگاہوں میں رکھا ہوا تھا اور وہ میری سیکورٹی پر مامور ہو چکے تھے، انہی میں سے کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اسی بنا پر میں نے اسے چیلنج دے دیا کہ اسے چوبیس گھنٹوں میں تلاش کر لوں گا۔ میری سیکورٹی پر مامور لوگ ناکام ہو گئے تھے۔ ڈیورا وہیں بینچ پر بیٹھی رہی تھی۔ اسے اسپتال والے اٹھا کر لے گئے تھے۔ جبکہ وہ انہیں جُل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ جہاں جہاں پھرتا رہا، اس کے بارے میں اروند سنگھ مجھے بتاتا رہا۔ صبح ہوتے ہی

ان کی دھمکی نظر انداز کر دی۔ اگلے دن میں نے زینت کو ساتھ لیا اور گھر چلا گیا۔

ایک ہفتے بعد ہم واپس لوٹنے لگے تو زینت نے مجھ سے مشورہ مانگا۔

''بھائی! میں نے تمہیں بتایا نہیں لیکن میری کلاس کا ایک لڑکا ہے، وہ مجھ سے محبت کے دعوے کر کے مجھے بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''مجھے بتایا نہیں تم نے، خاموش کیوں رہی ہو؟'' میں نے اس سے سخت لہجے میں پوچھا

''میں خاموش اس لیے ہوں کہ جب میں اسے کوئی ریسپانس نہیں دے رہی تو چند دن بھونک کر خاموش ہو جائے گا۔ دوسرا وہ طلبہ تنظیم کا ایک بڑا عہدیدار بھی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔'' اس نے روہانسا ہو کر کہا۔

''اب کیوں بتا رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں جاؤں ہی نہ یونیورسٹی، ابا کو بتاؤں ہی نہ، یا سب کچھ بتا دوں، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔'' اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔

''تم چلو یونیورسٹی، وہاں چلتے ہیں، دیکھا جائے گا۔ میں ٹھیک کر لوں گا سب۔'' میں نے اسے تسلی دلاسہ دیا اور اپنے ساتھ یونیورسٹی لے گیا۔ میں نے زینت کو ہاسٹل چھوڑا اور خود اس طلبہ تنظیم کے بڑے کے پاس چلا گیا۔ اسے ساری صورت حال بتائی۔ اس نے بڑے سکون سے سنی۔ پھر مجھے اطمینان رکھنے کا کہہ کر واپس بھیج دیا۔

تین دن گزرے تھے۔ اس صبح زینت نے مجھے فون کر کے بتایا کہ اسے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے وہ لا دوں۔ میں مارکیٹ گیا اور چیزیں لے آیا۔ اس کی کلاس ساڑھے دس بجے کے قریب تھی۔ اس نے دس بجے ہاسٹل سے نکلنا تھا۔ میں کچھ منٹ پہلے اس کے ہاسٹل جا پہنچا۔ وہ ہاسٹل سے نکلی تو میں اس کے لیے لائی ہوئی چیزیں اسے دے دیں۔ اس وقت جب میں وہ چیزیں اسے دے رہا تھا، اسی وقت اسی طلبہ تنظیم کے کافی سارے غنڈے وہاں آ دھمکے۔ ان کے ساتھ لڑکیاں بھی تھیں۔ انہوں نے پوچھا نہیں اور نہ کوئی بات کی، یک لخت مجھے مارنا شروع کر دیا۔ ساتھ میں ان کے منہ سے یہی نکل رہا تھا کہ فحاشی پھیلا رہے ہو، ڈیٹ لگا رہے ہو، بتاتے ہیں تم دونوں کو، میرا نشانہ تھا، انہوں نے زینت کو کچھ نہیں کہا۔ اُن کے ساتھ آئی لڑکیاں اُسے ہاسٹل میں دھکیل کر لے گئیں۔ انہوں نے مجھے یہاں تک مارا کہ میں ادھ موا ہو گیا۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد جو انہوں نے مجھ پر جو ظلم کیا، اس نے میری زندگی بدل دی۔

انہوں نے ایک گدھے کا بندوبست پہلے ہی کیا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے اس پر بٹھا دیا۔ ایک تار میں پرانے جوتے پروئے ہوئے تھے، وہ میرے گلے میں ڈال دیئے۔ موٹر سائیکل کے سائلینسر سے کالک لی اور میرے منہ پر لگا دی۔ ہاسٹل کی طرف والی جو سڑک تھی اس پر مجھے ڈال دیا گیا۔ وہ لمحہ ایسا تھا کہ میں موت کی دعا مانگ رہا تھا، لیکن مجھے موت نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس وقت مر گیا تھا۔ مجھے نہیں ہوش تھا کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ بس یہ آواز میرے دماغ کو پھاڑ دیتی تھی کہ جب لوگ پوچھتے کہ اسے گدھے پر کیوں بٹھایا ہے، تو جواب دیتے کہ یہ لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔ وہ میرے مرنے کا مقام تھا۔ میرا وجود تو زندہ تھا، لیکن میں مر گیا۔

نہر کے پل پر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں گدھے پر ہی تھا کہ گدھا مجھے نشیب کی جانب لے گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں وہاں کیسے گرا ہوں،

میں بے ہوش تھا، یہ کچھ دیر کی بے ہوشی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو میں وہیں نہر کنارے پڑا تھا اور لوگ میرے ارد گرد تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی فیصلہ تھا کہ مجھے مر جانا چاہئے۔ اس زندگی سے اب موت بہتر ہے۔ میں اٹھا اور سڑک کی جانب بڑھا۔ وہاں ٹریفک رواں تھی۔ میں نے چھلانگ لگائی اور ایک کار کے سامنے آگیا۔ مجھے بریک لگنے کی تیز آوازیں سنائی دی تھیں۔ اس کے بعد درد کی ایک تیز لہر میرے اندر سرائیت کر گئی اور مجھے ہوش نہیں رہا۔ میں نے خود کو کنفرم کر دیا کہ میں مر گیا ہوں۔

میری آنکھ کھلی تو میں بیڈ پر تھا۔ کافی ساری پٹیاں مجھے باندھی گئی تھیں۔ میں حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بولنا چاہا تو نہیں بول سکا۔ بلاشبہ میں نے کوئی ایسی حرکت کی ہوگی کہ ایک دم سے کئی لوگ آگئے، ان میں ڈاکٹر بھی تھے۔ وہ مجھے دیکھنے لگے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میں وہاں صرف ایک دن اور ایک رات رہا ہوں۔ اگلے ہی دن میں ایک بنگلے پر تھا، جہاں میرا باقاعدہ علاج ہونے لگا۔

وہ سکندر خان کا بنگلہ تھا۔ میں جس کار سے ٹکرایا تھا، وہ نجانے کون تھا۔ لیکن اس وقت یہی سکندر خان مجھے وہاں سے اٹھا کر اسپتال لایا تھا۔

''کیوں لائے مجھے؟ مرنے دیا ہوتا؟'' میرا اس سے پہلا سوال ہی یہی تھا۔

''جس وقت تم گدھے پر تھے تو میں تمہارے قریب سے اپنی کار پر گزرا تھا۔ میں اس وقت کار بریک نہیں کر سکا، میں اوپر سے گھوم کر آیا تو تم سڑک پر خون میں لت پت تھے۔ مجھے اسی وقت تمہاری بے گناہی کا یقین ہو گیا تھا۔ لہٰذا میں نے تمہیں اٹھایا اور تمہاری دیکھ بھال کی۔'' اس نے بڑے عام سے انداز میں کہا۔

''آپ کی ہمدردی نے......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ مجھے ٹوکتے ہوئے بولا۔

''بالکل نہیں، مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ ایک ذرہ برابر بھی نہیں۔ میرا وجدان تھا کہ تمہارے ساتھ ظلم ہو رہا ہے، وہی ہوا، میں نے جب تصدیق کی تو مجھے ساری بات پتہ چل گئی۔ وہ چند لوگ کون تھے، جو ہاسٹل گئے، کہاں اور کیسے پلان بنا، ہاسٹل میں کس لڑکی نے انہیں بتایا کہ تم وہاں آنے والے ہو۔ سب مجھے پتہ چل گیا۔'' اس نے پھر اسی عام سے لہجے میں جواب دیا

''مگر مجھے زندگی نہیں چاہئے، میں مرنا چاہتا ہوں۔ اب میں اس ظالم معاشرے میں نہیں جی سکتا۔'' میں نے احتجاجی لہجے میں کہا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہاں سے جانے کے بعد مر جانا۔ لیکن اگر تم ان لوگوں سے انتقام لے کر مرنا چاہو تو میں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''کیا تمہاری بھی ان سے دشمنی ہے؟'' میں نے پوچھا تو ایک دم سے ہنس دیا، پھر بولا۔

''میری نہ کسی سے دشمنی ہے اور نہ دوستی، میرے اپنے کام ہیں، میرے ساتھ کام کرو، اس کے عوض میں تمہیں ہر طرح کی مدد دوں گا۔ یہ ظاہر ہے کہ میرے سارے دھندے کالے ہیں، ایک بھی ایسا نہیں جو میں معاشرے کے سامنے فخر سے بتا سکوں۔ صاف کہوں تو بات یہ ہے کہ تم میرے اچھے ساتھی بن سکتے ہو، میرے ساتھ جڑ جاؤ گے تو طاقت، دولت اور حکومت تیرے قدموں کے نیچے ہوگی اور اگر بنا انتقام لیے مرنا چاہتے ہو تو کل ہی چلے جانا، میں نہیں روکوں گا، یہاں سے جاتے ہی مر جانا، یا کہیں ڈوب مرنا۔'' سکندر خان نے حتمی انداز میں کہا

اور میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

میرے ذہن میں صرف انتقام تھا۔ میری اب تک کی تحقیق ہے کہ غنڈہ ہو یا جرائم پیشہ، وہ حوصلے والا تو ہوتا ہے لیکن دل والا نہیں، اندر سے وہ بزدل ہوتا ہے۔ وہ کمزور پر ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن طاقت ور کے آگے فوراً جھک جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جیسے ایک شرابی اپنے دوستوں میں یا کمزور لوگوں میں بڑی بڑی کیں مارے گا، غل غپاڑہ کرے گا لیکن پولیس کے ادنیٰ سے اہلکار کو دیکھ کر خاموش ہو جائے گا۔

مجھے بالکل تندرست ہونے میں ایک ماہ لگ گیا۔ میں نے سکندر خان کو بتا دیا کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے مر چکا ہوں۔ اب جو کہو میں وہی کرنے کو تیار ہوں۔

''ہاں، تمہیں تھوڑا سا کچھ کرنا ہوگا، اس کے بعد تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا، سوائے اس کے کہ تم طاقت ور بنو۔''

''وہ جو تھوڑا سا ہے، وہ کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''جن لوگوں نے تمہیں ہاسٹل کے باہر مارا ہے، انہیں قتل کرنا ہے بس، ذرا سا کام ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ ذرا سا کام......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''تمہیں بس گولی چلانی ہے۔ باقی سب کام ہو جائے گا۔ اب جاؤ۔'' اس نے کہا اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

اسی رات، دس بجے کے بعد کا وقت ہوگا، مجھے بلایا گیا۔ میں ایک جیپ میں بیٹھا اور ان کے ساتھ چل دیا۔ وہ ایک باغ تھا، لیچی اور امرود کے پودے تھے وہاں۔ باغ کے باہر جیپ روک کر جب ہم اندر

نکاح

اسلام نکاح سے پہلے عشق کی اجازت اس لیے نہیں دیتا کہ انسان اپنی ساری محبتیں اس کے لیے بچا کر رکھے جو ان کا اصل حق دار ہے۔

شادی سے پہلے کی محبت گویا اس طرح کی ہے جیسے "افطاری سے پہلے کوئی روزہ افطار کرلے۔ افطار کا مزہ بھی نہ رہا گناہ کا مستحق بھی ہوا کفارے کا خرچ بھی اور سزا کا دھڑکا بھی رہا۔"

سلیم رضا...... فیصل آباد

گئے تو وہ چند لڑکے بندھے ہوئے وہاں پڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے پہلی بار پسٹل چلایا۔ نجانے کیسے اور کہاں گولیاں پڑتی رہیں، لیکن میں نے ہی ان سب کو مارا۔ اسی رات جب میں واپس سکندر خان کے پاس آیا تو میرے طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

''میں تمہیں ایک ایسی جگہ بھجوا رہا ہوں، جو دنیا سے الگ ہے، لیکن دنیا سے جڑی ہوئی ہے۔ وہاں دو برس رہو۔ ہر طرح کا اسلحہ چلانا سیکھو، پھر واپس آؤ۔ اس دوران اگر میں مر بھی گیا تو کچھ لوگ ہیں جو تمہیں سنبھال لیں گے۔ جاؤ، عیش کرو۔''

میں چلا گیا۔ وہ پاکستان ہی کا ایک علاقہ تھا۔ وہاں میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جدید ترین اسلحہ وہاں موجود ہے۔ ایک طرح سے وہاں پوری فوجی تربیت دے رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کتابوں اور جدید ریسرچ مہیا کی جاتی تھی۔ روزانہ اخبار وہاں

پہنچتا تھا۔

دو برس گزر جانے کے بعد میں لاہور واپس آ گیا۔ ان دنوں انٹرنیٹ نیا نیا آیا تھا۔ مجھے رہنے کو ایک جگہ دے دی گئی۔ جہاں میں سوائے کھانے پینے، ورزش کرنے سونے اور نیٹ پر نت نئی تحقیق کرنے کے اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ ایک برس میں یہاں رہا۔ میرے رابطے بڑھنے لگے۔ انہی دنوں مجھے پتہ چلا کہ سکندر خان کیا چیز ہے۔ وہ منی لانڈرنگ کا بادشاہ تھا۔ سوئی سے لے کر جہاز تک جو بھی شے بکنے والی ہوتی تھی اس کا تاجر تھا، اس کی سب سے بڑی آمدنی کا ذریعہ جوا تھا۔ اسے ذہنی طور پر شارپ لوگ چاہئے تھے۔ اس کا نیٹ ورک بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ وہاں تک رسائی لے جا چکا تھا، جہاں میری سوچ بھی نہیں جا سکتی تھی لیکن میں اس دنیا سے متعارف ہو گیا۔ میں نے یہ سمجھ لیا کہ دنیا کو جس طرح چاہئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ایک دن سکندر خان نے مجھے اپنے پاس بلا کر کہا۔

''تمہیں اپنے دشمن یاد ہیں؟''

''کیوں نہیں، میں انہیں بھولا ہوں اور نہ ہی انہیں بھول سکتا ہوں۔ وہ مجھے ہر پل یاد رہتے ہیں۔''

''دیکھو، دشمن کو کئی طرح سے مارتے ہیں۔ سازش کر کے یا سامنے آ کر للکار کر۔ وقتی طور پر سبق دے کر تھوڑا بہت، یا پھر ایسے کہ دشمن تو زندہ رہے، لیکن وہ مرا ہوا ہو، اسے ہر پل اپنی بے بسی کا احساس ہو۔ یہ سب سے بڑا اور بھیانک انتقام ہوتا ہے۔ دشمن کو وقت دینے کے لیے تین برس بہت ہوتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں ابھی نہیں، صرف ان کے بارے میں جانو، معلومات رکھو اور ایسی ضرب لگاؤ کہ وہ ہمیشہ کے لیے تڑپتا رہے کہ اس نے ایسا ظلم کیا ہی کیوں تھا۔''

''میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔

''انتقام کی آگ کو اپنی جدوجہد کا ایندھن بناؤ۔'' اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

''مجھے کیا کرنا ہے وہ میں سمجھ گیا ہوں آپ کیا کہتے ہو؟''

''دریا بہہ رہا ہے، اس میں ہاتھ ہی نہیں دھونے، بلکہ پوری طرح نہا لو۔''

ان دنوں ہیروئن کا ایسا نشہ سامنے آیا تھا، جس نے انسانی زندگی تو تباہ کرنی ہی تھی، عالمی طاقت کا یہ ہتھیار بھی بن گیا۔ جعلی ڈالر، ہیروئن کی پیداوار میں سرمایہ اور اس کی حفاظت، اسلحہ کی خرید وفروخت، ہیروئن کے ساتھ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی ہتھکنڈوں میں بھی یہی زہر استعمال ہونے لگا۔ اسی کے بل بوتے پر اندھی قوتوں کو فروغ دیا جانے لگا۔ جس سے منی لانڈرنگ کا بزنس کا پھیلنے لگا۔ پرائز بانڈ سے لے کر کرکٹ تک کا جوا عروج پکڑنے لگا اور اس نے ایک زمانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ریس کے گھوڑے کی جگہ کرکٹر نے لے لی۔ اس کے ساتھ ساتھ اندھی قوتیں اس طرح پروان چڑھیں کہ دہشت گردی بڑھنے لگی۔ جرم کی دنیا میں ان حالات کو اچھا خیال کیا جانے لگا تو پھر جرم بڑھتا ہی چلا گیا۔ انسانیت تڑپنے لگی اور موت کے سوداگر زندگیوں کا سودا کرنے لگے۔

جرم کے اس پھیلاؤ میں جدید آلات نے بڑی معاونت کی۔ انڈر ورلڈ نے اسے خوب استعمال کیا۔ ایک عام فون سے لے کر کمپیوٹر اور سٹلائیٹ سسٹم سے استفادہ کیا گیا۔ سامراجی نظام نے ایک نیا نقاب اوڑھ لیا۔

میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اگلے تیرہ برس میں نے پوری دنیا گھومی۔ انڈر

ورلڈ کا جو عالمی نیٹ ورک ہے نہ صرف اس کا حصہ بن گیا بلکہ اس میں ایک اہم طاقت مانا جانے لگا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میں اتنا طاقتور ہو جاؤں گا۔ پندرہ برس سے زیادہ اس دنیا میں گزر گئے۔ میں کڑھتا تھا۔ ظلم کے اس نظام نے بے گناہوں کے لیے یہ زمین تنگ کر دی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے مقدس لوگ اندر سے کس قدر گھناؤنے ہوں گے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ایک بات سمجھ لی کہ ہر بندہ بکاؤ ہے۔ نہ بکنے والے چند ہیں۔ یہ سوچ غلط ہے کہ دولت سے ہر شے خریدی جا سکتی ہے۔ دولت کے بغیر لوگ محبت میں بھی بک جاتے ہیں، اپنا آپ وار دیتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی کسی ایسے بندہ کو نہیں آزمایا۔ میں نے ہمیشہ انہی لوگوں پر سرمایہ کاری کی جو اندر سے غلیظ ہوں۔ پیسے کے لیے اپنی غیرت تک بیچ دیں۔ اس دوران میں نے اپنی الگ سے دنیا بنانا شروع کر دی تھی۔ لوگوں کا پیسہ لوگوں پر ہی خرچ ہوتا تھا۔ سکندر خان اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ میں اس دنیا ہی سے غائب ہو گیا، اپنی دنیا تخلیق کرنے کے لیے۔

بیس برس بعد جب میں لاہور میں واپس گیا تو میں ایک نئی دنیا تخلیق کر چکا تھا۔ میں اپنے خاندان کا ذکر اس لیے نہیں کر رہا کہ میں نے ان سے ناتہ ہی نہیں رکھا۔ میں ان کے لیے مر چکا تھا۔ میرے والدین اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ تایا بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ کزن تھے۔ لیکن زینت نہیں تھی، وہ میرے دکھ میں اپنی سانسیں کھو بیٹھی تھی۔ اسے یہی غم لے بیٹھا کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا۔ حالانکہ بہت بعد میں مجھے سمجھ آئی کہ دشمن تو یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہو گیا۔ لیکن رب تعالیٰ ایسے حالات بنا دیتا ہے کہ وہ وقتی طور پر بڑی ذلت آمیز شکست لگتی ہے، مگر وہ بہت بڑی فتح کی بنیاد بن جاتی ہے۔ جو بعد میں زندگی سنوار دیتی ہے۔

میرے تین دشمن تھے اور تینوں لاہور میں موجود تھے۔ بھتہ مانگنے والا عہدیدار جو اب ایک بڑا بزنس مین تھا، یونیورسٹی میں تنظیم کا بڑا سرغنہ جو ایک سیاست دان بن چکا تھا، زینت کو تنگ کرنے والا عہدیدار اسی سیاسی جماعت کی ایک ذیلی تنظیم کا سربراہ تھا اور اسکالر بن گیا تھا۔ میں چاہتا تو تینوں کو ایک وقت میں گولیوں سے چھلنی کروا دیتا لیکن یہ کوئی انتقام نہیں تھا۔ وہ لوگ جو یونیورسٹی میں میرے لیے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ان کے اندر داخل ہو کر ان کی تنظیم کو دیمک لگا دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنا وتیرہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ خیر یہ باتیں کسی دوسرے رخ کی ہیں۔ میں انہیں نہیں بھولا، شروع ہی سے انہیں اپنی نگاہ میں رکھا۔

انسان کا ظاہر اور باطن ایک ہو تو اسے کسی قسم کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ میرے دشمن تھے اور میں انہیں کبھی نہیں بھولا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ میں ان پر نگاہ نہ رکھتا۔ ان تینوں کے بے شمار بیرون ملک ٹور لگے۔ وہاں ان کی بے غیرتیاں بھی عروج پر تھیں۔ دلالوں سے ساز باز کر کے بہت کچھ اکٹھا کر لیا گیا۔ وہ سب کچھ آہستہ آہستہ جمع ہوتا گیا۔ سکندر خان مر گیا تھا۔ اس کی جگہ اس کے بیٹے نے لے لی تھی۔ میرا شمار ان کے بااعتماد لوگوں میں ہوتا تھا۔ میں جو اپنے کالے دھندوں کا پھیلاؤ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کو بھی مرتا ہوا دیکھ رہا تھا، جو غداری کرتے تھے، یا وہ مقابلے میں مارے جاتے، وہ مقابلہ پولیس سے ہوتا، فورسز سے یا پھر دوسری کسی پارٹی سے۔ دھندے کے پھیلاؤ میں مجھے اپنے آپ کو محفوظ کرنے اور زیادہ سے زیادہ خفیہ نیٹ ورک بنانے کا جنون سوار ہو گیا، جو میرے بڑے کام آیا۔

میرے تینوں دشمنوں کے بچے مختلف اداروں میں پڑھ رہے تھے۔ بزنس مین کی بیٹی، سیاست دان کا بیٹا اور اسکالر کی بیٹی۔ یہ تینوں نئے دور کی پیداوار تھے۔ ان تینوں کے عشق چل رہے تھے۔ ان تینوں کے ساتھ ایک ایک بندہ لگا دیا گیا۔ ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ''تخلیہ'' کا حصول تھا۔ جو انہیں مہیا کر دیا گیا۔ لوگوں کے عیبوں پر نگاہ رکھنے والے اپنے بچوں کی تربیت سے غافل ہو جاتے ہیں، یہی ان کا حال تھا۔ وہ دنیا کے سامنے بڑے مقدس تھے۔ لیکن ان کی اپنی اولاد کیا کر رہی ہے انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی۔ اس تخلیے میں انہوں نے کیا کیا گل کھلائے، یہ وہی جانتا تھا، جس نے ان کی ریکارڈنگ کی۔ تخلیے کی ملاقاتیں رنگ لے آئیں۔ انہی دنوں میں وہاں پہنچ گیا۔ میرے سامنے تین سی ڈیز رکھ دی گئیں۔

میں نے سب سے پہلے بزنس مین کو اس کی بیٹی والی سی ڈی بھیجی۔ دو گھنٹے میں جب اس کے پاس وہ سی ڈی پہنچ گئی تو میں نے اسے فون کیا۔

''سی ڈی دیکھ لی تم نے؟''

''ہاں آئی تو ہے، کون ہو تم اور کیا ہے اس میں تم ہی بتا دو'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''میں ایک گھنٹے بعد فون کرتا ہوں۔ اب میں نہیں بتاؤں گا، تم خود بتاؤ گے یا پھر شہر بھر کے لوگ۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس دوران میں نے دوسروں تک بھی سی ڈیز پہنچا دی۔ آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا کہ بزنس مین کا فون آ گیا۔ اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

''میری بیٹی کو بچا لو، میری عزت داؤ پر لگ گئی ہے، جتنی رقم چاہو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''مجھے رقم نہیں چاہئے۔ صرف خودکشی چاہئے، تم کر لو یا تمہاری اولاد کر لے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے سیاست دان کو فون کیا۔ اس نے اپنے کیریئر کا، اپنے بچے کے کیریئر کا رونا رویا۔ میری مرضی کا پیسہ دینے کو تیار تھے۔ میں نے اسے بھی خودکشی کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ تیسرے کے ساتھ بھی یہی کیا۔ تینوں دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ میں نے انہیں ایک جگہ بلوا لیا۔ تینوں کو معلوم نہیں تھا میں کون ہوں، ہر ایک کو یہی پتہ تھا کہ وہ مجھے اکیلا ہی ملنے جا رہا ہے۔ وہ سب پہنچ گئے۔ ان تینوں کو الگ الگ بٹھایا گیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد تینوں کو بلوا لیا۔ وہ میرے سامنے تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے ان سے سوال کیا۔

''تم تینوں میں مشترک کیا ہے؟''

''طلبہ تنظیم۔'' ان کا یہی جواب تھا۔

''مجھے کیوں نہیں پہچان پا رہے ہو؟''

کچھ دیر بعد وہ سمجھ گئے کہ میں کون ہوں۔

''ہمیں معاف کر دو'' ان کا یہی کہنا تھا۔

''تم لوگوں سے انتقام لینے کی وجہ سے میری زندگی خرچ ہو گئی۔ تم لوگوں نے ظلم کیا، مجھے تو مارا ہی، ذلیل کیا، میں ذلت کیسے بھول جاؤں اور وہ بھی میری ہی بہن پر الزام، صرف اس لیے کہ تم لوگوں کی غنڈہ گردی قائم رہے۔ معافی تو ہے نہیں، بولو تم تینوں خودکشی کرو گے یا تمہارے بچے؟ کل تک فیصلہ بتا دینا۔ چلے جاؤ۔''

یہی وہ وقت تھا جب میں کسی دوسرے ہی دشت کی سیاحی میں نکل کھڑا ہوا۔

ان لوگوں نے اپنی بقا کی جنگ لڑنا تھی۔ ان سے جو ہو سکا، انہوں نے اپنے وسائل اور تعلقات استعمال کیے کہ مجھے مار ڈالا جائے۔ اگلے دن کی شام تک انہوں نے مجھے مارنے کے لیے کئی لوگ تیار کر لیے۔ میں

ہی نہیں رہوں گا تو باقی کیا بچے گا۔ مجھے ان کی جو مصروفیات تھیں پتہ چلتی رہیں۔ میں سوچتا رہا کہ اگر میرے پاس وسائل اور طاقت نہ ہوتی تو یہ مجھے اب تک مار چکے ہوتے؟ نجانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ ہمارے درمیان بساط بچھی ہوئی ہے۔ وہ تینوں ایک طرف ہو گئے ہیں اور اپنے مہرے کی چال دے دے رہے ہیں۔ اور میں اپنے مہرے چلا رہا ہوں۔ اسی دن مجھے خیال آیا کہ اگر میں مہرے ہی خرید لوں تو بساط پر اپنی مرضی سے کھیل کھیل سکتا ہوں۔ میری طاقت صرف اور صرف انفارمیشن تھی۔ بر وقت معلومات، جیسے اگر ان کی سازش کے بارے میں مجھے پتہ نہ چلتا کہ انہوں نے وار کیسے کرنا ہے تو میں ان کے چنگل میں پھنس جاتا۔ اس دوران مجھے یہ پتہ چل گیا کہ ان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟ میں نے خود سامنے آئے بغیر ان تک رسائی کی، انہیں کہا کہ اگر ہم انہیں راستے سے ہٹا دیں تو...... جواب مثبت آیا۔ اسی رات انہیں پار کر دیا گیا۔ وہی لوگ جن سے وہ مجھے مروانا چاہتے تھے، انہوں نے ہی انہیں مار دیا۔ ان کے بچے ہمیشہ کے لیے میرے قابو میں آ گئے۔

میں ہمیشہ کے لیے لندن آ گیا۔ میرے قریب ترین دو لوگ تھے، جو میرے بارے میں سب جانتے تھے۔ میں نے انہیں ہوا بھی نہیں لگنے دی اور ان کی نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ میں نے جدید ترین آلات کا استعمال کیا۔ اپنے گرد ایک حلقہ بنایا۔ میں صرف انہیں ہی کہتا ہوں۔ وہ آگے کوڈ اور ڈی کوڈ میں بات کرتے ہیں۔ ہم نے پہلے پاکستان میں لوگوں کو تلاش کیا۔ انہیں طاقت اور رقم فراہم کی انہوں نے ہمارے لیے کام کیا اور خوب کیا۔ اپنے مخصوص مطالبات منوانے کے لیے کیا حربے استعمال کیے، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ پھر بھارت میں یہی کیا۔ وہاں بہت زیادہ بکاؤ مال ہیں۔ خاص طور پر دھرم کے نام پر بلیک میل کرنے والے بہت ہیں۔

جس طرح حکومت کوئی پل یا عمارت خود تعمیر نہیں کرتی، بلکہ کسی ٹھیکے دار کو اس کا ٹھیکہ دیتی ہے۔ اسے کام چاہئے ہوتا ہے، اسی طرح کالے دھندے کے لوگ ٹھیکہ دیتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔

ایک بالکل سامنے کی بات ہے۔ غریب خواب بہت دیکھتا ہے، کیونکہ اس کے پاس خوابوں کے علاوہ ہوتا کچھ نہیں۔ یہی خواب اپنے اندر بہت بڑے بڑے آئیڈیا چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب ہوتا کیا ہے، ان خوابوں کی تعبیر کے لیے سرمایہ دار دولت خرچ کرتا ہے اور انہی خوابوں کو اپنی دولت میں اضافے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ میں نے بھی غریبوں کے خواب خریدے ہیں اور اس سے دولت نہیں بڑھائی بلکہ صرف طاقت حاصل کی۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ طاقتور کا ساتھ دیتے ہیں، کمزور کو رگید دیتے ہیں۔

ایک انسانی نفسیات اور ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنے دل میں ایک خواہش رکھتا ہوں، مثلاً ایک ہندو، مسلمان کو مارنا چاہتا ہے، یا مسلمان ایک ہندو کو ختم کرنا چاہتا ہے، ایک فرقہ یا مسلک کے لوگ دوسرے کو ختم کرنا چاہتے ہیں، میں صرف ان کی خواہش پوری کرنے کے لیے سہولیات دیتا ہوں، وہ خواہش بھی پوری کر لیتے ہیں اور انہیں دولت بھی مل جاتی ہے۔

میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس دنیا میں نجانے کتنی قوتیں ہیں جو اپنا اپنا مفاد حاصل کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی دشمن ہوتا ہے اور کہیں کوئی دوست بنتا ہے، نہ دشمنی پائیدار نہ دوستی۔ مفاد لیا اور الگ ہو گئے۔ لڑائی وہاں مچتی ہے جب ایک ہڈی پر دو کتے جھپٹ پڑیں۔ میں ہڈی پر نہیں جھپٹتا، بلکہ ہڈی رکھتا

تھا۔ یہی میری کامیابی تھی۔"

"اسی تلاش میں تم میری نگاہوں میں آگئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب بانیتا کور تمہارے پاس پاکستان آئی تھی، کیوں آئی تھی، مجھے پتہ ہے، پھر جو کچھ بھی ہوا، وہ سارے میرے مہرے تھے۔" اس نے طویل بات کے بعد لمبی سانس لی

"کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں تھک گیا ہوں۔ میں سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ میں آزادانہ گھوم پھر نہیں سکتا۔ میں نارمل زندگی نہیں گزار سکتا، میرے بچے نہیں ہیں۔ کیا پایا میں نے اتنا سب کچھ کر کے؟"

"ہاں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ساری زندگی ایک نظریہ کے لیے لڑتے رہتے ہیں، منافقت کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں حتیٰ کہ رشتے ناتے اور تعلق کی بھی پروا نہیں کرتے، لیکن ایک وقت آتا ہے کہ جب تمہارے جیسی سوچ پیدا ہو جاتی ہے۔ باطل نظریہ کی پہچان ہی یہی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ نہیں پوچھو گے کہ میں تمہیں یہاں تک کیوں لایا ہوں؟"

"تم خود ہی بتا دو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"میں یہ سب تمہارے حوالے کر کے ایک پرسکون زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"کیوں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تم میں اور مجھ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے جمال، تم کسی مقصد کے لڑ رہے ہو یا نہیں، لیکن تیرے ارد گرد جو لوگ ہیں بغیر کسی لالچ کے تم پر اپنی جان وار دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ تم کیا ہو؟ مجھے اس کی سمجھ نہیں آسکی، تم پاکستان میں تھے لیکن جب بانیتا کور پر حملہ ہوا، تم وہاں بھی تھے۔ میں بڑے بڑے شعبدہ بازوں کا جانتا ہوں، کئی ایسوں کو میں نے ہائیر کیا ہوا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عام آدمی ایسی صورت حال سے نہیں نکل سکتا، جیسے تم نکل آئے تھے، تمہارے ساتھ کوئی دوسری قوت ضرور ہے، جو تمہاری مدد کر رہی ہے۔" اس نے تیز لہجے میں کہا اور ساری بات کہہ کر یوں ہو گیا جیسے اس پر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھ کر سوچتا رہا پھر میں نے پہلو بدل کر کہا۔

"اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم جتنی بھی طاقت حاصل کر لو، اس کا انجام کیا ہے؟ موت نا، کیا ساری دنیا کی طاقت تمہیں موت سے بچا لے گی؟ نہیں نا؟ تم اور مجھ میں فرق صرف یہی ہے کہ تم زندگی کے تعاقب میں ہو، زندگی چاہتے ہو، لیکن میں موت کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ تمہیں یہ پتہ ہے کہ موت آگئی تو سب ختم، میں جانتا ہوں کہ موت ہے ہی نہیں، مٹی کا وجود ختم ہے تو اگلا دور شروع ہو جائے گا۔"

"یہ صرف طفل تسلیاں ہیں۔ جنگجوؤں نے یہ سب گھڑا ہوا ہے، آخر لوگ جنگ کیوں لڑتے، انہیں ایسی سوچ دے دی گئی، جس کے بل بوتے پر وہ لڑتے تھے، آج بھی دیکھ لو، دنیا بھر میں جتنے نام نہاد مذہبی لوگ ہیں، وہ سب یہی کر رہے ہیں۔ جنت کے، سورگ کے، نروان کے ٹکٹ بانٹ رہے ہیں۔ یہ سوچ ہی ہے نا جو جنگ پر آمادہ کرتی ہے اور لوگ لڑ رہے ہیں۔" اس نے کافی حد تک اکتاہٹ سے کہا تو میں نے بڑے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔

"دیکھو! اگر تم تحمل سے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو تو میں تمہیں یہ فرق واضح کر دیتا ہوں کہ جنگ کیا ہے اور جہاد کیا ہے۔"

"بولو، میں سن رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

''جستجو، تلاش، کوشش، جدوجہد میں زندگی پڑی ہے۔ یہ زندگی ظاہر ہو رہی ہے اعمال سے، جو عمل کیا جاتا ہے۔ اب یہ زندگی ہے نا، یہ ہے تو اس میں آرزو پڑی ہے۔ آرزو اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی، جب تک مقصد نہ ہو۔ مقصد ہوتا ہے مقصود کا اور مقصود ہوتا ہے دل میں۔ دل ہوتا ہے انسان کے اندر۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہ دل میں آرزو کیسی ہے؟ اُسی طرح کے اعمال ظاہر ہوں گے اور وہ آرزو کس کے لیے ہے؟''

''تم کہنا یہ چاہتے ہو کہ انسانی خواہشات ہی اسے جدوجہد میں لگا دیتی ہیں۔'' وہ بولا۔

''ابھی تم سنو، فیصلہ بعد میں دینا۔'' میں نے کہا، ایک لمحہ رُکا اور پھر بولا۔

''انسان کو سب ہی اشرف المخلوقات مانتے ہیں، تو اس کی عقل بھی اشرف ہونی چاہئے۔ اور بلا شبہ اس کی عقل اشرف ہے۔ عقل کے ساتھ ہر شے کو زیر کر لیا اور کرتا چلا جا رہا ہے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ عقل تو ہر شے تسخیر کر رہی ہے، کیا یہ اس کے اشرف ہونے کا ثبوت ہے؟ کیا اس کے اعمال ثابت کر رہے ہیں کہ وہ اشرف عقل والا ہے؟ اب اشرف عقل ہے کیا؟ دوسرے انسانوں کا قتل یا انسانیت کی حفاظت؟ اس کے اعمال بتا رہے ہیں کہ اس کی آرزو کیا ہے اور اس کے دل میں کون ہے؟ اب سنو، میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک کلاس روم میں جتنے بھی طالب علم ہیں، بظاہر وہ سب وہیں حاضر ہیں، سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن حاضر اسے ہی تسلیم کیا جائے گا، جو استاد کے ساتھ ذہنی تعلق جوڑے بیٹھا ہے۔ وہ حاضر نہیں مانا جائے گا، جو کلاس میں تو موجود ہے لیکن اس کا ذہن کہیں دوسری جگہ بھٹک رہا ہے۔''

''تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟'' وہ تیزی سے یوں بولا، جیسے اگلی بات وہ سمجھنا چاہتا ہو۔

''اعمال بتاتے ہیں کہ میں حاضر ہوں یا نہیں۔ سنو، یہودی، عیسائی، یا جو بھی غیر مسلم ہیں، اپنا حاضر ہونا ثابت کر رہے ہیں۔ جس طرح وہ حاضر ہونا ثابت کر رہے ہیں، اس طرح حاضر ہونا ممکن نہیں، چاہے انہوں نے اپنا آئین و قانون بنا لیا ہے۔ ہم مسلمانوں کا جو نظام ہے وہ کہاں ہے، ہم کہاں حاضر ہیں؟ میں پاکستان کی بات کرتا ہوں، ہم اگر مسلمان ہیں تو ہمارا نظام عشق اور محبت ہے، انسان اور انسانیت سے محبت والا نظام۔ رحمت اللعالمین ﷺ نے فرمایا ہے نا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں، اگر ہمارے دل میں اللہ مقصود ہے، ہماری آرزو کا محور رحمت اللعالمین ﷺ ہے تو پھر یہاں وہ نظام ظاہر کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ اگر یہی معیار بنا لیا جائے تو کیا پاکستان میں مسلمانی ہے؟ ہم خود فیصلہ کر لیں کہ ہم حاضر ہیں یا غیر حاضر؟ ہمارے کردار سے ہمارا ہونا ظاہر ہو رہا ہے؟ کیا دوسروں کے لیے سلامتی ہے؟ اگر ہم مقام مسلمانی پر حاضر نہیں تو پھر ہم میں کون حاضر ہے؟ بلاشبہ وہ شیطان ہی ہو سکتا ہے۔ جو کسی بھی دوسرے مسلمان کے قتل کی آرزو رکھتا ہو۔ عشق و محبت والا آئین جو نبی رحمت اللعالمین ﷺ نے دیا، وہ سلامتی ہے۔ وہ کیوں ظاہر نہیں ہو رہا؟ ہم اپنا جائزہ لیں، ہم میں کون حاضر ہے؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر میں مسلمان ہوں تو دوسروں کو مجھ سے سلامتی ملنی چاہئے۔ میں اپنے انتقام کے چکر میں کہاں سے کہاں تک بھٹک گیا؟'' اس نے افسوس سے کہا۔

''جب تک تیری مسلمانی یا میری مسلمانی مجھ میں حاضر نہیں تو میں اور تم غائب ہیں۔ مسجد میں میری

مسلمانی حاضر ہے، لیکن جب دوکان پر ملاوٹ والی شے بیچ رہا ہوں تو اس وقت مسلمانی کہاں ہے؟'' میں نے سمجھایا

''بلاشبہ غائب ہے؟'' وہ بولا۔

''اب تم خود سوچ لو، تجھ میں کیا حاضر ہے۔ کہیں تم اپنی مسلمانی سے غائب تو نہیں ہو؟ مسلمانی غائب ہے تو شیطانیت ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ہمہ وقت حاضر رہوں۔'' اس نے پوچھا۔

''اپنے دل کے ساتھ جڑو۔ اہل دل کے ساتھ جڑو، تاکہ تمہیں دل کی معرفت ملے، یہ دیکھو کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''یار، یہ کیا بات کر رہے ہو، خودکش بم لے کر خود کو پھاڑ دینے والا بھی دل کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔'' وہ تیزی سے یوں بولا جیسے اکتایا ہوا ہو۔

''میں نے پہلے ہی تمہیں سمجھا دیا ہے کہ دل میں مقصود کون ہے اور تمہارے اعمال کیا بتا رہے ہیں۔ انسان اور انسانیت کا قتل کرنے والے کے دل میں شیطان بیٹھا ہوا ہے اور اگر اس کے اعمال انسان اور انسانیت کی بھلائی کے لیے ہیں تو اس کے دل میں رحمان ہے۔ فیصلہ تم خود کر لو۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے، کیا میں نے جو اتنا بڑا نیٹ ورک بنا لیا اور جو چاہتا ہوں وہ کر رہا ہوں کیا دل سے نہیں ہوا؟ اب تک تم نے جو کہا، کیا میں شیطانیت کی راہ پر ہوں؟ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' اس نے تیز لہجے میں الجھتے ہوئے کہا۔

''یہ تم خود دیکھ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، اور کیا کر رہے ہو۔ ہامان، قارون، شداد اور نمرود میں سے کس کی راہ پر ہو۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''میں اب بھی کہتا ہوں کہ یہ جنگجو لوگوں کا وہ میٹھا نشہ ہے جو وہ لوگوں کو دیتے آئے ہیں، اور اب تک دے رہے ہیں، اسی کے زیر اثر لوگ لڑتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ خود محلوں میں رہتے ہیں اور لوگوں کو قناعت کا درس دیتے ہیں۔ دنیا میں چند لوگ عام لوگوں کو لڑاتے چلے جا رہے ہیں، کون مانتا ہے خدا کو سب طاقت کی ہوس میں لگے ہوئے ہیں، جس کا بس چلتا ہے وہ دوسرے کو مار دیتا ہے، یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے نا۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''میں پھر کہوں گا کہ دل کے ساتھ جڑو۔ کیونکہ یقین دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر یقین نہیں تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''بہت بحث ہو چکی یار، اب کام کی بات کر لیں۔'' اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا مطلب تھا کہ اب تک جو باتیں ہوئیں ہیں وہ کام کی نہیں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ تمہارا فلسفہ ہے، تم جانو، یا جو سمجھنا چاہے وہ سمجھے، میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ یہ جو میں نے نیٹ ورک بنا دیا ہے، اس میں ایمپائر کھڑی کر دی ہے، اسے سنبھالو اور مجھے......''

''نہیں، مجھے نہیں چاہئے۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میرے بزرگوں نے کہا ہے کہ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے اور تم جانتے ہو کہ میں اپنی دنیا آپ پیدا کر چکا ہوں۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم مجھے یہ آفر کیوں دے رہے ہو، کیونکہ میں جانتا ہوں۔''

''کیا جانتے ہو تم؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''یہی کہ میں آج نہیں تو کل تمہاری یہ ایمپائر ختم کر دینے والا ہوں۔ یہی جنگ اور جہاد میں فرق

ہے۔ جہاد فتنے کو ختم کرتا ہے اور جنگ طاقت کے لیے لڑی جاتی ہے۔ میں تمہیں اتنا کہتا ہوں کہ اپنی یہ شیطانیت چھوڑ کر غائب ہو جاؤ یا توبہ کرلو، ورنہ میں تمہیں ختم کردوں گا۔ اب بھی تمہیں موقعہ دے رہا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم نہیں مانو گے۔" اس نے خرخراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں کہتا ہوں کہ اٹھ کر چلے جاؤ اور سدھر جاؤ۔ میں تمہیں ایک موقعہ دے چکا ہوں۔ جاؤ۔" میں نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"میری مرضی کے بغیر تم لندن سے باہر نہیں جا سکتے ہو، میری بات مانو گے یا زندگی کے آخری سانس یہیں گزار دو گے، یہ میرا چیلنج ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ میں ہلکے سے مسکرا دیا۔ میں نے اسے وہ سمجھایا تھا، جس سے اس کی زندگی سنور جاتی، لیکن وہ ایسا پتھر تھا، جو خود کو دوزخ کا ایندھن بنانے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کرلیا کہ اگر اس نے مجھے لندن سے باہر جانے پر روکا تو میں اس کی ساری طاقت سلب کرلوں گا۔

☆......☆......☆

صبح کی ابھرتی ہوئی کرنیں دربار صاحب پر پڑ رہی تھیں۔ دربار صاحب کا سنہری کلس، سرود صاحب میں دکھائی دے رہا تھا، جس کے ساتھ صبح کی سنہری کرنیں کھیل رہی تھیں۔ سرود صاحب کے ارد گرد بنے پرکرما پر کھڑے جسپال سنگھ اور بانیتا کور نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے گیان میں مگن تھے۔ وہ دونوں رات ہی سندیپ کور اور نوتن کور کے ساتھ امرتسر آ گئے تھے۔ وہ رات سکون سے سوئے اور صبح ہوتے ہی وہ دونوں دربار صاحب آ گئے۔ انہیں رات وہاں جانے کے لیے خود سردار رتن دیپ سنگھ نے کہا تھا۔ انہیں وہاں کسی کا انتظار تھا۔ وہ کچھ دیر اپنے دھیان میں رہے۔ پھر لنگر خانے کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ لنگر خانے کے گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ ایک نوعمر سا لڑکا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ہلکی ہلکی داڑھی اور مونچھ، بڑی بڑی آنکھیں، اس نے سفید کرتا پہنا ہوا تھا۔ سر پر بسنتی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ وہ وہاں کا کوئی طالب علم لگ رہا تھا۔

"ست سری اکال سردار جسپال سنگھ ڈھلوں جی۔" اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر بڑے نرم لہجے میں فتح بلائی اور پورا نام دہرایا تو ایک بار جسپال چونک گیا۔

"ست سری اکال، واہگرو جی کی فتح۔" اس نے بھی ہاتھ جوڑ کر فتح بلائی تو اس لڑکے نے کہا۔

"سردار جی، میرے ساتھ آئیں، آپ جی سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔"

"چلو، جی۔" اس نے کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ کسی نے اس نوعمر لڑکے کو بھیجا تھا تو صرف اس لیے کہ کسی کو شک نہ ہو۔ وہ انہیں لے کر کمپلیکس کی جانب چل پڑا۔ وہ چند قدم آگے تھا۔ چند راہداریاں پار کرنے کے بعد وہ اسے کھلے میں موجود ایک کمرے کی جانب بڑھا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے دروازے تک آ گئے۔ تبھی دروازہ کھل گیا۔ ایک کمرے کے بعد اگلے کمرے میں ایک بوڑھا سنگھ زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آؤ جسپال اور بانیتا پتر، میں کھڑا نہیں ہو سکتا، ورنہ میں......" اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں سردار جی آپ تشریف رکھیں۔" جسپال نے تیزی سے کہا۔

''آؤ بیٹھو۔'' اس نے اپنے سامنے چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ دونوں بیٹھ گئے۔ وہ بوڑھا سنگھ چند لمحے تک یوں آنکھیں بند کر کے سوچتا رہا جیسے مراقبے میں ہو۔ پھر ان کی جانب دیکھ کر بولا۔

''میرا نام سرجیت سنگھ بندیال ہے۔ میں سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالے کا وہ سیوک ہوں، جوان کے ساتھ شہید نہ ہو سکا، سا کا چوراسی کے وقت میں یہاں تھا ہی نہیں، میری ڈیوٹی کسی اور جگہ تھی۔ میں وہیں رہا، اس مہان پرش پر قربان نہیں ہو سکا۔ پر اب لگتا ہے، بہت سارا وقت گزر جانے کے بعد بھنڈرانوالے کا ویژن کیا تھا۔ اگلی نسل کو کس نے بتانا تھا کہ سکھی کیا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ جیسے سوچ رہا ہو۔ پھر بولا۔

''رتن دیپ سنگھ جی نے بہت کام کر لیا۔ دشمن نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ وہ چاہے بھی تو کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے ایک ایک لفظ کو وہ سن رہے ہیں۔ وہ بے بس ہو گیا ہے۔ وہ ایسا شیر ہے، جسے پنجرے میں بند ہونا پڑا ہے۔ اور میں اب موت کے دہانے پر ہوں، میرے جیسے کئی سیوک میری طرح کی حالت میں ہیں، اس لیے میں نے سب سے صلاح لی ہے کہ اب یہ کام اگلی پیڑھی کو دے دیا جائے، تم سمجھ رہے ہو نا؟'' اس نے جسپال کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جی میں سن رہا ہوں۔'' اس نے تیزی سے لیکن دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''ہم پچھلے دو ماہ سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ تیرے بارے میں بہت باتیں بھی سنی ہیں۔ ہماری صلاح یہ ہے کہ تم اب سکھی کا وہ کام سنبھالو، جواب تک ہم کرتے آئے ہیں۔'' اس نے بڑے گہرے لہجے میں کہا۔

''سردار جی، مجھے سکھی کی کوئی بھی سیوا کرنے میں کسی بھی قسم کا کوئی حرج نہیں۔ لیکن میں اتنی بڑی ذمے داری نہیں نبھا سکتا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں؟'' سردار نے تحمل سے پوچھا۔

''نہ تو میں کوئی گیانی ہوں اور نہ ہی میرا سکھی کے بارے میں اتنا علم ہے، جو جس نے بتایا، مجھے اتنا ہی پتہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم اس رستے کے راہی ہیں، جس کا گزر اندھیروں میں سے ہے۔ کب کہاں اور کیسے موت آ جائے، اس کا کوئی پتہ نہیں۔ اس وقت سکھی کو اس نوجوان لیڈر کی ضرورت ہے جو کہہ دے تو وہ ہو جائے۔ ایسے کردار والا جس پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ یہاں اسی سکھوں کے مقدس مقام پر شہیدوں کا نشان بنانا چاہتے ہیں تو وہ نہیں بن پا رہا۔ وہ لیڈر چاہئے جو منافقوں کو اپنے قبیلے سے نکالے۔'' جسپال نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

''تو پھر بتاؤ کون ہے وہ؟'' سردار نے اسی تحمل سے کہا۔

''یہ تو آپ بڑے ہیں، آپ کی نگاہ اور مشاہدہ ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔'' جسپال سنگھ نے سکون سے کہا۔

''سیاسی طور پر جو بندہ بھی ہم چن لیں، تو کیا تم اس کی پیروی کرو گے۔'' اس نے پوچھا۔

''بالکل، جب تک وہ سکھی کے لیے کام کرے گا، ادھر اُدھر ہوا تو نہیں۔'' جسپال نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تو سردار چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

''دیکھو، جسپال سنگھ، سکھی کو اس وقت غیروں سے اتنا خطرہ نہیں، جتنا اپنوں سے ہے۔ بڑی بڑی سازشیں تیار ہو چکی ہیں اور ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ میں پچھلے دو مہینے سے پنجاب میں پھر رہا

ہوں۔ میں نے بہت کچھ دیکھا اور سمجھا ہے۔ میں وہ تمہیں بتاتا ہوں۔"

"جی میں سن رہا ہوں۔" جسپال نے مودب لہجے میں کہا تو بوڑھا سردار گونج دار آواز میں بولا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ بقائے انسانیت اعتدال پر قائم ہے۔ جب بھی انسانی معاشرے سے اعتدال نکلتا ہے، اسی وقت تنزلی شروع ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس نے موت خود پر وارد کر لی جو دوسرے کو شکار بنانے کے لیے جو موت بناتا ہے، پہلے وہ موت اسی پر وارد ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔" اس نے کہا تو جسپال خاموش رہا، تب وہ کہتا چلا گیا، "سا کا چوراسی کے بعد کئی برس تک سکھ نوجوان ہندو کی بھینٹ چڑھتے رہے۔ اس سے سکھی کمزور نہیں ہوئی بلکہ زیادہ مضبوط ہوئی ہے۔ بہت سارے نوجوان بھارت سے نکل گئے، انہوں نے دوسرے ملکوں میں اپنے آپ کو آزمایا، دولت کے انبار جمع کیے۔ لیکن اندر کا انتقام ختم نہیں ہوا۔ ایک نسل سے دوسری نسل میں یہ انتقام منتقل ہو گیا۔ بھارت سے باہر بیٹھے سنگھ آج بھی تڑپ رہے ہیں۔ وہ رقم سے ان نوجوانوں کو مضبوط کر رہے ہیں۔ مگر ان کی رقم ضائع جا رہی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ یہاں کی سکھ تنظیمیں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو باہر کا مال لے کر صرف کاغذی کارروائی کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ایسے نوجوان ہیں جو نہ صرف سکھی کو سمجھتے ہیں بلکہ اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ وہ "انکھ" والے ہیں۔ وہ اپنی انا رکھتے ہیں۔ رقم کے حوالے سے کمزور ہیں لیکن سکھی کے لیے یہی کارآمد ہیں۔ ایک تیسری قسم ہے جو یہاں کے سنگھ تو ہیں لیکن سازشوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ نشوں نے ان کو مار دیا، عیاشی اور سکھی سے دوری نے انہیں کسی "جوگا" نہیں چھوڑا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان نوجوان میں جو کمزوری ہے، وہ ختم ہو جائے اور وہ سکھ پنتھ کے لیے کام کرنے لگیں۔"

"آپ کے وچار بہت اچھے ہیں لیکن اس کے لیے وہ لیڈر......" جسپال نے کہنا چاہا تو بوڑھا سردار بولا۔

"میں نے تمہیں لیڈر چن لیا ہے۔ جب تک میری سانس ہے، مجھ سے جو چاہو ملے گا، لیکن انہیں ایک رستہ دے دو۔ مجھے یقین ہے تُو اپنی نئی دنیا بنا لے گا۔"

"ٹھیک ہے سردار جی، میں کوشش کروں گا کہ آپ سے کچھ نہ مانگوں، ایک نئی دنیا بنانے کا خواب میں پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" جسپال نے کہا تو بوڑھے سردار سرجیت سنگھ بندیال کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ اس نے پاس پڑے بیگ میں سے ایک ڈی وی ڈی نکالی اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

"پورے پنجاب سے وہ سنگھ اور کوریں جنہیں میں نے اس کام کے لیے تیار کیا ہے، ان کے بارے میں ساری پوری معلومات اس میں ہے۔ یہ جتنے لوگ بھی ہیں، میں انہیں تمہارے بارے میں بتا دوں گا اور......"

"نہیں سردار جی، اب مجھے اپنے طریقے سے کام کرنے دیں۔ میں ایک لیڈر دوں گا آپ کو، وہ سامنے ہوگا۔ وہی حکم جاری کرے گا۔" جسپال نے کہا تو بوڑھے سردار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

ان کے درمیان بات ختم ہو چکی تھی۔ تبھی ان کے سامنے لنگر چن دیا گیا۔ انہوں نے سیر ہو کر کھایا۔ پوری گفتگو میں بانیتا کور ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔

دوپہر سے کافی پہلے وہ واپس حویلی آ گئے تھے۔ ان کے پاس سردار رتن دیپ سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ساری بات سنی اور پھر ان دونوں کی جانب دیکھ کر بڑے ہی جذباتی لہجے میں کہا۔

''جو کہا ہے اب اس پر پورا اتر کر دکھانا۔ بانیتا پتر میں نے تمہیں سکھی کے لیے دان کیا۔''

''دھن بھاگ میرے باپو کے۔ میں مایوس نہیں کروں گی۔ جان وار دوں گی۔'' اس نے بھی کہا۔

''بس جو کرو سو بھلا، اس پر مزید بات کی گنجائش ہی نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ تبھی بانیتا کور نے جسپال کا ہاتھ پکڑا اور اپنے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جسپال! اب تک جو بھی ہوا، وہ ایک یارانہ تھا، اب صرف سکھی کے لیے لڑنا ہے۔ ہمارے گرو ہمیں موقع دے رہے ہیں۔''

جسپال نے بانیتا کور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے سر سے نیچے کیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔

''جو بولے سو نہال او۔''

''ست سری اکال او۔'' بانیتا کور نے اس کے نعرے کا جواب دیا اور اس کے گلے لگ گئی۔

☆......☆......☆

میں اور جنید ائیر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ پچھلی نشست پر تانی تھی۔ دو دن میں نے اس کے ساتھ گذارے تھے۔ اتنی باتیں کرنے کے باوجود دل نہیں بھرا تھا۔ اس دوران جنید نے بہت سارا ہوم ورک کر لیا تھا۔ ہیتھرو ائیر پورٹ کی بلڈنگ میں ہم جب داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جس جہاز سے ہم نے جانا تھا، اس نے صبح کے وقت لاہور پہنچنا تھا۔

''وعدہ کرو کہ بہت جلد اماں اور سوہنی کے ساتھ یہاں آؤ گے۔'' تانی بالکل روانگی کے وقت کافی جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی بھیگی آنکھیں صاف کیں اور بڑے سکون سے کہا۔

''میں نہ آ سکا تو انہیں ضرور بھیج دوں گا۔ ورنہ تم چلی آنا تم پر پابندی تھوڑا ہے۔''

''ہاں، میں یہاں اکیلی رہ کر اکتا چکی ہوں۔'' اس نے کہا تو جنید نے اعلان کی طرف توجہ دلائی۔ ہم ائیر پورٹ کے مراحل کے لیے چل پڑے۔

ہم جہاز میں بیٹھ چکے تھے اور جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ بالکل ایسے وقت میں جہاز کی فنی خرابی کے بارے میں بتایا گیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا گیا کہ کچھ دیر بعد روانگی ہو گی۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ مسافروں کو اُترنے کا کب کہتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، جہاز کے اندر چند لوگ آ گئے جو دیکھنے میں یوں لگ رہے تھے جیسے بزنس مین ہوں، لیکن نگاہ رکھنے والے تاڑ گئے کہ وہ خفیہ کے لوگ ہیں۔ وہ شروع سے لے کر آخر تک گئے وہ واپس پلٹ پڑے۔ اگلے چند منٹوں میں جہاز خالی کرنے کا کہہ دیا گیا۔ مجھے راشد محمود عرف گاڈ فادر کی بات یاد آ گئی کہ وہ مجھے لندن سے نہیں نکلنے دے گا۔ میں پر سکون تھا۔ میں نے ان سب متوقع صورت حال کا بندوبست کر رکھا تھا، جو وہ ان حالات میں کر سکتا تھا۔ جیسے ہی ہم لاؤنج میں واپس آئے تو وہاں پتہ چلا کہ جہاز میں بم کی افواہ ہے۔ لیکن یہ صرف مسافروں کے ''بہلانے'' کی ایک کوشش تھی۔ اس گیم کے پیچھے بہت کچھ چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب گاڈ فادر اپنا کام دکھا رہا ہے۔''

''میں تو اسے بہت ذہین آدمی سمجھتا تھا، لیکن وہ نرا بے وقوف قسم کا مہرہ نکلا، اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ایسا کر کے اس نے اپنی موت کو خود آواز دی ہے۔ وہ پھر بچ جائے گا، جو اس کے پیچھے ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' اس نے کافی حد تک

تشویش سے پوچھا۔

"چائے، گرم گرم چائے پی جانی چاہئے۔" میرے یوں کہنے پر جنید نے میری طرف دیکھا، پھر بات کو سمجھتے ہوئے ہنس کر پوچھا۔

"اس سے پہلے کہ ہم سے پوچھ تاچھ شروع ہو، چائے پی لی جائے۔"

"ہاں، یہ کی ہے ناسیانوں والی بات۔" میرے یوں کہنے پر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں وہاں اکیلا ہی بیٹھا رہا۔ میں نے فون نکالا اور تانی کو کال ملا دی۔ وہ ابھی تک ائر پورٹ پر ہی تھی۔ اس نے میری بات سنی اور فون بند کر دیا۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا، اسی نے کرنا تھا۔ یہاں تک کہ جنید چائے لیکر واپس آ گیا۔

ہم چائے پی رہے تھے۔ جنید کو پتہ تھا کہ اس نے کیا کہنا ہے۔ وہ پرسکون تھا۔ ہمارے چائے پینے کے دوران بہترین سیاہ سوٹ پہنے چند گورے ہماری جانب بڑھے۔ ان میں سے ایک ہماری جانب آیا، باقی ذرا پیچھے ہی کھڑے رہے۔ وہ کافی فربہ مائل تھا، اس کی ٹھوڑی کے نیچے گوشت لٹک رہا تھا موٹے موٹے نین نقش والی کی آنکھیں یوں تھیں جیسے سوجی ہوئی ہوں۔ اس نے میرے قریب آ کر بڑے اچھے انداز میں "گڈ ایوننگ" کہتے ہوئے اپنا تعارف کرایا

"میرا نام سٹیورٹ جان ہے، میں یہاں کی سیکورٹی میں ایک آفیسر ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں، کیا آپ میرے ساتھ میرے آفس میں چلیں گے، جہاں ہم اطمینان سے باتیں کر سکیں۔"

"بالکل، کیوں نہیں چلیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا پھر ڈسپوزل ایبل کپ ایک طرف رکھا اور اشارے سے پوچھا کس طرف جانا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا تو میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ جنید کو بھی لے کر جائیں گے۔ میں ان کے ساتھ چلتا ہوا ایک سادہ سے آفس میں آ گیا۔ سٹیورٹ نے ایک کرسی کی جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مسٹر جمال! تم لندن کیوں آئے تھے؟"

"بزنس ٹور کے لیے؟" میں نے جواب دیا

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم جتنے دن یہاں رہے اس کی تفصیلات کیا ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل، میں بتا سکتا ہوں لیکن آفیسر! مجھے یہ کنفرم کر دیں کہ کیا میں حراست میں ہوں۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا ہے؟ مجھ سے تم تفتیش کر رہے ہو؟" میں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

"نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ معمول کی کارروائی ہے۔ کیونکہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کوئی دہشت گرد اسی جہاز سے واپس جا رہا ہے، جس نے کوئی یہاں پلان کیا ہے اور جو لندن کے لیے بہت خطرناک ہے۔" سٹیورٹ نے صاف لفظوں میں کہا۔

"او کے تم جو چاہو سوال کر سکتے ہو ایک دن، چند دن، مہینہ یا جتنے بھی دن تم چاہو، تمہارے مطمئن ہو جانے تک یہیں ہوں۔ تم اپنا اطمینان کرو۔" میں نے سکون سے کہا اور کرسی سے ٹیک لگا لی۔

"تم اتنے بااعتماد کیوں ہو؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بھی مسکرا دیا

"اس لیے کہ میں نے کوئی غیر قانونی کارروائی نہیں کی، نہ تمہارے ملک کا قانون توڑا اور نہ ہی کسی پلان میں شامل ہوں۔ بلکہ تم کہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"میری مدد؟ وہ کیسے؟" سٹیورٹ نے پوچھا۔

"سنو! کیا تم لوگوں نے اطلاع دینے والے کے

بارے میں جان لیا ہے کہ وہ کون ہے؟ یہ اطلاع کس نے دی؟ اسے کیسے پتہ کہ کوئی دہشت گرد اس جہاز سے جا رہا ہے؟ اسے اس تفتیش میں لائے؟" میں نے کہا۔

"ہاں! اس کے بارے میں چھان بین کی جا رہی ہے، بہت جلد اس کا پتہ چل جائے گا۔" اس نے بتایا

"مطلب آپ کے یعنی سیکورٹی کے کسی بندے نے اطلاع نہیں دی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، کسی شہری نے یہ اطلاع دی ہے۔" اس نے کہا تو میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب آپ جتنے چاہیں سوال کریں۔ اگر میں پاکستان پہنچ بھی گیا تو تمہارے ساتھ تعاون کروں گا۔" میں نے کہا اور سکون سے بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے مختلف سوال کرتا رہا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد اس نے مجھے جانے کا کہہ دیا۔ میں لاؤنج میں آ گیا۔

میں دوبارہ تانی کو کال ملائی اور اسے اپنے بارے میں بتایا۔ اس گفتگو میں ایسا کوئی لفظ بھی نہیں تھا، جو شک کے زمرے میں آ جاتا۔ ممکن ہے میری کال بھی کہیں سنی جا رہی ہو۔ کیونکہ اس وقت میرے پاس ایک عام سیل فون تھا۔ اس نے اشارے میں بتا دیا کہ اس نے اپنا کام کر دیا ہے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، ہمیں واپس جہاز میں جانے کو کہہ دیا گیا۔ ہم جہاز میں سوار ہو کر اطمینان سے بیٹھ گئے اور کچھ دیر بعد جہاز ٹیک آف کر گیا۔

مجھے راشد محمود عرف گاڈ فادر آ گیا۔ اس کے ملنے کر بعد مجھے اس کے بارے میں سب پتہ چل گیا۔ میرے سمجھانے کے باوجود بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ہوتا بھی ایسے ہی ہے۔ انسان کی اپنی عقل پر پردہ پڑا ہوتا ہے۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا ہوتا۔

کوئی بندہ خدا کا انکار کر دے، یا خدا کو تسلیم کر لے اس سے خدا کی ذات کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وہ خود خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ ویسے ہی انسانیت سے گر جاتا ہے۔ اس سے بھی خدا کو فرق نہیں پڑتا۔ خدا کا انکار یا خدائی دعویٰ، فرعونیت سے بندہ اپنے مقام بندگی کا انکار کر دیتا ہے۔

یہ انسان ہی کے لیے ہے کہ وہ بندگی کے مقام پر فائز ہوتا ہے اور اس کی بندگی اس کے اعمال سے ظاہر ہوتی ہے۔ انکار خدا کرنے والا، تسلیم کرنے والا، خدائی کا دعویٰ کرنے والا، انسان ہی ہے، دوسری کسی مخلوق سے یہ عمل سرزد نہیں ہو رہا ہے۔ انسان ہی یہ کر رہا ہے۔ اسی سے ہی عمل ظاہر ہو رہا ہے۔ اب بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان کا "ہونا"۔ اگر یہ ہے تو اعمال ظاہر ہو رہے ہیں اگر انسان ہی نہیں تو پھر کوئی بحث ہی نہیں۔ انکار یا تسلیم کرنے کے جو بھی اثرات ہیں وہ انسان پر ہی ہیں۔ اپنے آپ کو غلام مانے گا تو آقا ظاہر ہوگا۔ اگر بندگی والے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ بندے کے اعمال اسے بندگی پر فائز کریں گے، یہی بندے کی بلندی ہے۔ جب وہ مقام بندگی کا محرم ہو جاتا ہے تو وہ ذات کبریا کے مقام کو مان لیتا ہے۔ یہی بندگی اسے رب تعالیٰ سے جوڑ دیتی ہے۔ یہ ہی وہ رستہ ہے جو رب تک جاتا ہے۔ یہی انسان کا ارتقاء ہے۔ اور انسان کے ارتقاء کا جو راستہ نبی رحمت ﷺ نے عطا کر دیا، وہ اصل راستہ، وہی صراط مستقیم ہے۔

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی

یا بندہ خدا بن یا بندہ زمانہ

جب انسان بندگی کے مقام پر فائز ہوتا ہے تو پھر باقی سب غیر پر تلوار پھر جاتی ہے۔

اصل بات ہے اپنے آپ کو ماننے کی، خود کو بندہ

ماننے کی۔ اپنی فطرت کو ماننے کی۔ وہ تخلیق ہے اور اس کا کوئی خالق ہے۔ اپنے آپ کو مان لینے کا مطلب ہے کہ میں بندہ ہوں تو اس نے اپنے رب کو تسلیم کر لیا۔ تب وہ بندگی کے مقام پر فائز ہو گیا۔ اس نے اس ذات کی غلامی تسلیم کر لی، جس میں شہنشاہی ہے۔ مقام بندگی پر حاضر ہونے کا مطلب ہے کہ وہ رب کے حضور حاضر ہو گیا۔ یہ یقین کے رب اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ انسان پر پردے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ رب کی جلوہ افروزیاں نہیں دیکھ پا رہا ہے۔ یہ حجاب صرف خودی سے اٹھتے ہیں۔

خودی دل کی غیرت ہے۔ جو کسی غیر کو دل میں نہیں آنے دیتی۔ غرور و تکبر، ہوائی و ہوس، فتنہ، تفرقہ، دوئی، شرک، غیر، ضد، ظلم، گمراہی۔ یہی خس و خاشاک ہیں اور آتش عشق کا شعلہ تند و سرکش و بے باک، اس خس و خاشاک کو جلا کر خاکستر دینے والا قوت ہی خودی ہے۔ یہ سارے مراحل بے شک عشق ہی طے کراتا ہے۔ جب بندے کا رُخ خُدا کی طرف ہوتا ہے تو اس کا سفر بلندی کی طرف ہو جاتا ہے پستی سے ناتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ غلامی آزاد کر دیتی ہے، حرص، ہوس اور لالچ سے۔ کیونکہ بندگی کا عرفان ہونے ہی سے بندے کو اپنی ذات کا عرفان ملتا ہے۔ یہ دل کے زندہ کر لینے سے ہوتی ہے۔ اپنی معرفت حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔' خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں...... یہی توحید تھی جسے نہ تُو سمجھا نہ میں سمجھا۔

لاہور کا موسم بہت خوشگوار تھا، جب ہم ائرپورٹ سے نکلے۔ راستے میں مجھے جنید نے بتایا تھا کہ وہ اس سے کیا پوچھتے رہے تھے۔ اس سے یہی ظاہر تھا کہ کہیں ہم دونوں کی باتوں میں تضاد ہو اور ہم دھر لیے جائیں۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہم کار میں بیٹھ کر جب ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکلے تو میرا سیل فون بج اٹھا۔ وہ گاڈ فادر کا فون تھا۔ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم نکل جاؤ گے لیکن پاکستان کی زمین تم پر تنگ کر دی جائے گی۔ تم سمجھتے ہو نا کہ پاکستان ایک جنگل ہے، جس کے پاس جتنا پیسہ ہے وہ اتنا ہی قانون کو اپنی لونڈی سمجھتا ہے، وہ قانون بھی خرید سکتا ہے، اپنی مرضی سے جو چاہے وہ ہوتا ہے۔“

”جس طرح تمہارے دعوی کے باوجود میں یہاں آگیا ہوں، اسی طرح میرا ربّ میری حفاظت کرنے والا ہے۔ تم فکر نہ کرو، ابھی کچھ دیر میں تمہارے ساتھ کیا ہوگا، تم نہیں جانتے ہو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا، دیکھتے ہیں۔“ اس نے کہا اور قہقہہ لگا دیا ”اور یہ بھی جان لو کہ تم سوائے ایک مہرے کے کچھ بھی نہیں ہو، مہرہ وہ بھی پیادہ، گھوڑا ابھی نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں ہنس دیا تو اس نے کہا۔

”تم بھی تو مہرے ہو؟“

”یہ وقت بتائے گا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سوہنی والے گھر میں جا پہنچا۔ طارق نذیر نے اسے دوبارہ بہترین انداز میں سجا دیا تھا۔ میں بیڈ پر سیدھا ہو کر لیٹا ہی تھا کہ اروند کا فون آگیا۔

”پاکستان واپسی پر خوش آمدید۔ پاکستان میں گاڈ فادر کے جو چند لوگ تھے، وہ سب حراست میں لے لیے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ عالمی دہشت گرد تنظیم کا نام جوڑ دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے اہم ایک نوجوان ہے، جو سارے پیغام ڈی کوڈ کر کے آگے دیتا تھا۔ مطلب، احکام دینے اور لینے والے، جو یہاں کے ہائیر کیے ہوئے لوگوں کے درمیان تھے، وہ ختم ہو گئے ہیں۔ ابھی وقت لگے گا، نئے لوگ بنانے میں،

لیکن ابھی ان میں ان دیکھی دیوار بن چکی ہے، ان میں کوئی رابطہ نہیں رہا۔"

"باقی بھی چند دن میں صاف ہو جائیں گے، تم نے وہ کام کیا جو میں نے بتایا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"وہ تو آج صبح ہی ہو گیا تھا۔"

"کوئی مشکل؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔" اس نے بتایا۔

دراصل یہی انہی کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے گاڈ فادر والے جتنے بھی اکاؤنٹ تھے، ان میں جس طرح پونڈ آگے پیچھے جا رہے تھے، ان سب کو سمجھا۔ لندن کے لوگوں نے ان کے منی لانڈرنگ والے دھندے کو سمجھ کر مدد کی اور ان کا جو سرمایہ تھا، وہ سب نکال لیا اور ایسی کمپنیوں کو ادائیگی کر دی جو صرف نام کی تھیں۔ کروڑوں پاؤنڈ ان کے ہاتھ لگے تھے۔ جو نہ صرف انہوں نے سنبھال لیا، بلکہ ٹھکانے بھی لگا دیا تھا۔

"اب یہ جو درمیان میں خلا ہے، اس کے کوڈ اور ڈی کوڈ سمجھے ہیں کہ نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سمجھ لیے ہیں؟" اس نے بتایا

"تو پھر ان سب کو یہ حکم جاری کر دو کہ شام تک کوئی بندہ کسی سے بات نہ کرے۔ شام کے بعد بات کی جائے گی۔ سکون کریں۔" میں نے کہا۔

"ہو گیا۔" اس نے کہا تو میں نے او کے کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں نے بیڈ پر لیٹ کر سبھی خیالوں کو ذہن سے نکالا اور سو گیا۔ دو گھنٹے بعد میری آنکھ کھلی تو میں فریش تھا۔ میں نے جنید کو وہیں لاہور میں چھوڑا اور نور نگر کے لیے چل دیا۔ مجھے شام سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔

☆......☆......☆

جسپال اور بانیتا کور حویلی کی سرنگ کے راستے سے باہر کی جانب جا رہے تھے۔ دونوں کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ وہ اس وقت یوں دکھائی دے رہے تھے، جیسے کوئی دیہاتی جوڑا ہو۔ وہ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ انہوں نے نہ تو سندیپ کور کو بتایا اور نہ نوتن کور کو۔ وہ ایک آٹو رکشے پر بیٹھے اور بس اسٹینڈ کی جانب چل دیئے۔ وہ دونوں ایک عام سی بس میں بیٹھ گئے جو بٹالہ کی طرف جانے والی تھی۔ تھوڑی دیر میں بس لوگوں سے بھر گئی تو چل پڑی۔ بس مختلف جگہوں پر اسٹاپ کرتی چلتی چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ 'جوگوان' کا اسٹاپ آ گیا۔ وہ دونوں وہیں اتر گئے۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا تعاقب تو نہیں ہو رہا۔ کوئی ان کی نگرانی تو نہیں کر رہا ہے۔ اسٹاپ پر وہی دونوں اترے تھے۔ سڑک پہ دور دور تک دونوں طرف کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ 'جوگوان' کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑے۔ کوئی سو قدم چلنے کے بعد انہیں سامنے سے ایک فور وہیل آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ان کے پاس آ کر رک گئی۔ ایک نوجوان اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور پھر سے اسٹاپ کی جانب چل پڑے۔ واپس سڑک پر آ کر وہ اسی طرف چل دیئے جس طرف سے بس آئی تھی۔ اس دوران انہوں نے کپڑے بدل لیے۔ دونوں جینز اور شرٹ میں تھے۔ آنکھوں پہ سیاہ گاگلز، انہوں نے اپنا روپ ہی بدل لیا تھا۔ تھوڑا سفر کرنے کے بعد وہ سڑک سے دائیں جانب مڑ گئے۔ جس کے اختتام پر اکال گڑھ گاؤں تھا۔

انہیں اکال گڑھ گاؤں میں نہیں جانا تھا بلکہ گاؤں کے باہر مغربی طرف سے سڑک جنوب کی طرف جاتی تھی۔ وہ کچھ آگے جا کر دائیں جانب مڑ تی تھی۔ اسی پر وہ فارم ہاؤس تھا۔ جو کسی زمانے میں رتن دیپ سنگھ نے خریدا تھا۔ تب سے

وہیں گورتیج سنگھ اور اس کی بیوی ملکیت کور رہتے آئے تھے۔ ان کی ایک ہی بیٹی روپ کور تھی جو بیاہ کر کینیڈا شفٹ ہوگئی تھی۔ ان دنوں وہ وہیں آئی ہوئی تھی۔

فارم ہاؤس پر ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ گورتیج سنگھ، ملکیت کور اور روپ کور، ان کے وہاں پہنچتے ہی پورچ میں آگئے۔ وہی تینوں جانتے تھے کہ یہ کون ہیں لیکن اپنے نوکروں کو دکھاوے کے لیے یہ بتایا گیا کہ یہ کینیڈا سے آئے ہیں۔ روپ کور کے دوست کینیڈا سے آرہے ہیں۔ وہ کچھ دن یہاں رہیں گے۔ یہ کچھ دن کتنے ہونے تھے، یہ انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ یہ پنجاب پر ریسرچ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ فارم ہاؤس کے اندر کافی بڑی ہساری رہائش گاہ تھی۔ جس کا ایک مخصوص حصہ ان کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ بیڈ روم میں جا پہنچے۔ وہاں جاتے ہی اپنی عادت کے مطابق بانیتا کور بستر پر جا گری۔ جسپال سنگھ ملازمین کا لایا ہوا سامان ٹھکانے لگوا رہا تھا۔ یہاں تک کہ لنچ کے بعد وہ دونوں ہی سو گئے۔

شام کے وقت جب وہ بیدار ہوئے تو فریش ہو کر وہ چھت پر آگئے۔ ارد گرد وہی گاؤں کا ماحول تھا۔ چاروں طرف کھیت تھے۔ ان میں سبزہ ہی سبزہ تھا۔ شمال کی جانب کافی فاصلے پر ٹیوب ویل تھا۔ جس کے ارد گرد کافی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں کے ماحول سے لطف اندوز ہوتے رہے، پھر کرسیوں پر آن بیٹھے۔ شام اتر چکی تھی۔ تبھی جسپال نے اپنا فون نکالا اور اروند سنگھ کے نمبر ملا دیئے۔ کچھ دیر بعد ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

"میری میل پڑھ لی تھی۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں، پڑھ لی تھی۔ اس وی وی ڈی کی کاپی بھی مل گئی ہے، جس میں لوگوں کے ایڈریس ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے سردار سرجیت سنگھ بندیال کی وہ تحریر بھی پڑھ لی ہے۔ ہم اسے دیکھ لیں گے۔ میں اور فہیم نے ان سے رابطے کا ایک طریقہ کار بنا لیا ہے، جو میں تمہیں تفصیل سے بھیج رہا ہوں۔ یہ سب نیٹ ورک میں جیسے ہی آتے ہیں، کوئی پلان کر لیں گے۔"

اس نے پوری تفصیل سے بتا دیا

"جمال کدھر ہے، اس نے دیکھا؟" جسپال نے پوچھا۔

"وہ ابھی یہاں نہیں پہنچا، لیکن کچھ دیر میں پہنچ جائے گا۔ وہ کہیں قریب ہی ہے۔ وہ جیسے ہی آتا ہے، میں اس سے شیئر کر لیتا ہوں۔" اروند نے جواب دیا۔

"اوکے، میں انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ بات کرنے کے بعد وہ دونوں نیچے اپنے کمرے میں آگئے۔ انہوں نے وہ سامان کھولا۔ اس میں بڑے شمارت قسم کے آلات تھے۔ وہ ان سے یہاں بیٹھ کر کسی سے بھی رابطہ کر سکتے تھے۔ اس کی یہی خصوصیت تھی کہ اس کوئی نیٹ ورک پکڑ نہیں سکتا تھا۔

رات گئے جمال کا فون آگیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے کہا۔

"تمہیں فی الحال کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سکون کرو۔ ایک دو دن میں وہ سب نیٹ ورک میں آجائیں گے۔ پھر ہم پلان کر لیں گے کہ کرنا کیا ہے۔"

"ہم ادھر آرام سے پڑے رہیں، امرتسر سے یہاں آنے کا فائدہ؟" جسپال نے پوچھا۔

"یہ میرا فیصلہ نہیں تھا سوہنے، تم جب اپنی من مانی کرو گے تو یہی ہوگا۔ یہ سیٹ اپ تم اوگی میں بھی بنا سکتے تھے۔ یہاں تم جلدی نگاہوں میں آجاؤ گے۔"

"میں نے کون سا یہاں ہمیشہ رہنا ہے، زیادہ سے زیادہ دو ہفتے اور بس؟" جسپال نے پوچھا۔

''تم اپنا سیٹ اپ سیدھا کرو اور اس کے بعد چپ چاپ چندی گڑھ نکل جاؤ، نوتن اور سندیپ کو بھی ساتھ لو۔ بلکہ انہیں اب پہلے بھیج دو، بعد میں تم چلے جانا۔ وہیں سے آپریٹ کرو۔ رونیت اور گریلین بھی تمہیں جوائن کرلیں گی، میں انہیں یہاں سے بھیج دیتا ہوں۔ انہیں آنے میں وقت لگے گا، وہ ذرا گھوم کے آئیں گیں۔''

''کیا یہ تم نے پہلے ہی سوچا ہوا ہے؟'' جسپال نے پوچھا۔ تو جمال بولا۔

''ہاں، رات میں جب سفر کر رہا تھا، اس وقت سوچا۔ میں مانتا ہوں کہ تم پر بھاری وقت ہے، لیکن جو میں دیکھ رہا ہوں، وہ اس سے کہیں زیادہ بھاری وقت آنے والا ہے اور یہ سب حالات ہم نے مل کر دیکھنے ہیں۔ گھبرانا نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''اوکے۔'' جسپال نے کہا اور پھر کچھ دوسری باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ وہ بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ میں، اروند اور فہیم کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہیں مہوش اور باقی سب تھے۔ میں لندن ٹور کے بارے میں انہیں پہلے ہی سے معلوم تھا، اس لیے زیادہ بات نہیں ہوئی۔

''اروند! یہ جو لسٹ تمہیں یہاں کے لوگوں کی ملی ہے اور اس سے پہلے بھی ہمیں ان دلالوں کی ملی تھی، کیا یہ دونوں ایک ہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''زیادہ تر ان میں وہی لوگ ہیں، تھوڑا سا کچھ فرق ہے، چند لوگ نئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا تو میں نے فہیم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''فہیم، تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ تم انہیں کس طرح استعمال کر سکتے ہو یا وہ ہمارے کسی کام آ سکتے ہیں۔''

''میرے خیال میں انہیں مارنے سے کچھ نہیں ہو گا، وہ انتقاماً مزید لوگ لے آئیں گے۔ مطلب پلان وہی رہے گا، بس اس میں لوگ آگے پیچھے ہوتے رہیں گے۔ اصل بات ہے کہ دشمن جو پلان لے کر آتا ہے، وہ اس میں پوری طرح شکست کھائے۔ اس سے ان کا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ انہیں لگے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ شیطان کا جو ایجنڈا ہے، اس کا قلع قمع کیا جائے۔'' فہیم نے اپنی سوچ سے آگاہ کیا تو کراچی میں بیٹھا ہوا سلمان فوری طور پر بولا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ جب تک یہاں کے سہولت کار شیطان کو راستہ نہیں دیں گے، اس وقت تک آپ کا پلان بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ دونوں طرف سے کوشش کرنا ہوگی، یہ ضروری ہے۔''

''تم دونوں ایک ہی بات کر رہے ہو۔ جب سہولت کار ہی نہیں ہوگا تو وہ اپنا پلان ہوا میں رکھیں گے۔ لیکن ہم ایسے بھی نہیں کریں گے کہ جس پر شک ہوا اسے ختم کرتے چلے جائیں۔ اصل میں دیکھنا یہ ہو گا کہ وہ کون سا پلان لا رہے ہیں، اسے ختم کرنے میں جو بھی کرنا پڑے، بہرحال ختم کریں گے۔ بس کوئی بھی پلان کامیاب نہ ہونے دیں۔'' میں نے اپنی رائے دی تو مہوش بولی۔

''کوئی بھی پلان جب بنتا ہے نا، وہ نہ صرف حالات کو دیکھ کر بنتا ہے، بلکہ وہاں دستیاب سہولت کو دیکھ کر بنایا جاتا ہے۔ جیسے ہم نے نہیں جانا ہے تو ہم وہاں کے موسم کے مطابق کپڑے رکھتے ہیں، وہاں کی کرنسی کو ذہن میں رکھتے ہیں، رہنے یا دیگر سہولیات ہمارے دماغ میں ہوتی ہیں۔ یہاں کا ماحول ایسا ہو کہ کوئی پلان بناتے وقت لاکھ مرتبہ سوچے۔ آج اگر ملک کے حالات درست نہیں ہیں،

قانون شکن زیادہ طاقتور ہیں تو اس کا یہاں ایسا ماحول بنایا گیا ہے۔"

"تو پھر ہم ایسا کرتے ہیں کہ ابھی تھوڑا سوچ بچار کریں کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ طے ہے یہ جو ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا "حرم" ہے، ہمارا گھر، اسے ہم نے بچانا ہے، اس کی حفاظت ہمارے ذمے ہے۔" میں نے کہا تو ہم سب اٹھ گئے۔ میں نے تو سوچا ہوا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اس لیے میں سیدھا اماں کی طرف چلا گیا۔ جہاں سوہنی میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں اماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سوہنی آگئی۔ وہ اماں کو دوائی دینے لگی تو میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ میں کاریڈور میں آ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ آگئی۔

"یہاں کیوں کھڑے ہیں؟" اس نے ہولے سے پوچھا تو میں نے کہا۔

"میرا انتظار مت کرنا، سو جانا۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔"

"کہیں جا رہے ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"میں چھت پر ہوں۔ مجھے کچھ لوگوں سے رابطے کرنے ہیں، تم ڈسٹرب ہوگی۔" میں اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہوں گی میں ڈسٹرب، بیڈروم میں چلیں، یا میں بھی آپ کے ساتھ چھت پر آتی ہوں۔" اس نے شوخی سے کہا تو میں ہنس دیا۔

"ٹھیک ہے آ جانا۔" میں نے کہا اور چھت پر چلا گیا۔

موسم کافی خوشگوار تھا۔ میں نے جاتے ہی اروند سے رابطہ کیا، وہ ابھی تک اپنے کمپیوٹر کے سامنے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا جنید نے مقامی نیٹ ورک کو الرٹ کر دیا ہے؟"

"جی وہ انتظار میں ہیں۔" اس نے جواب دیا

"کیا تم، میں اور جنید ایک ساتھ رابطے میں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی وہ آپ کی بات سن رہا ہے۔" اروند نے کہا تو جنید تصدیق کرتا ہوا بولا۔

"میں سن رہا ہوں۔"

"تو سنو، خورشید خان ہے ایک بزنس مین ہے، اس کا بائیو ڈیٹا ابھی تمہیں اروند دے دیتا ہے۔ اسے بڑے سکون سے پکڑنا ہے اور ماڈل ٹاؤن والے سیف ہاؤس میں لے جانا ہے۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔"

"میں نے تمہیں میل کر دیا ہے جنید۔" فہیم کی آواز آئی تو جنید بولا۔

"میں دیکھتا ہوں۔"

"وہ بعد میں دیکھنا، پہلے سن لو۔ اس وقت وہ مال روڈ پر موجود جیم خانہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ لڑا رہا ہے۔ وہاں چند غیر ملکی آئے ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ غیر ملکی ایک خاص پلان کے تحت وہاں پر موجود ہیں لیکن ابھی انہیں چھیڑے بغیر صرف خورشید خان کو اٹھانا ہے، میں لحہ بہ لحہ تمہارے ساتھ ہوں۔" فہیم نے اسے بریف کرتے ہوئے کہا۔

"او کے، میں نکلتا ہوں۔" جنید تیزی سے بولا۔

"او کے تم نکلو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" فہیم نے کہا تو جنید کی طرف سے خاموشی چھا گئی۔

آدھے گھنٹے میں وہ جیم خانہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے آس پاس مقامی نیٹ ورک کے لوگ تھے، جن سے اس کا رابطہ ہو چکا تھا۔ خورشید خان اس وقت ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے باہر نکلنے تک اسے انتظار کرنا تھا۔ وہ باہر رہا اور اس کے ساتھ مقامی نیٹ ورک بھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ یونہی گزر گیا۔ تبھی

وہ کمرے سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ ایک غیر ملکی لڑکی تھی۔ وہ شراب کے نشے میں تھی اور خورشید خان نے اسے تھاما ہوا تھا۔ خورشید خان کا ڈرائیور کار لے آیا۔ خورشید خان نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس غیر ملکی لڑکی کو پچھلی نشست پر پہلے بٹھایا اور پھر خود بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کے ساتھ اس کا ایک گارڈ بیٹھ گیا تو کار چل دی۔ اس کے پیچھے ہی اس کی سیکورٹی والی کار بھی نکل پڑی۔ دونوں میں فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔

جنید الرٹ ہو گیا تھا۔ جیسے ہی جیم خانے سے وہ دونوں کاریں نکلیں، جنید بھی ان کے پیچھے لگ گیا۔ اس کے ساتھ تین کاریں تھیں۔ چھ کاروں کا یہ قافلہ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ جنید اور مقامی لوگوں میں سب طے تھا کہ کرنا کیا ہے۔ جیسے ہی وہ نہر پر چڑھے، جنید اور اس کے ساتھیوں نے کوشش کی کہ کسی طرح سیکورٹی کار اور خورشید خان والی کار کے درمیان آیا جائے۔ ٹرن لیتے ہوئے ایک کار ان کے درمیان آ گئی۔ تب جنید نے بھرپور رسک لیا اور کار خورشید خان کے ساتھ لگا دی۔ پچھلی کار اس سے بھی آگے نکل گئی۔ انہوں نے گھیرے میں لے لیا۔

پلان یہ تھا کہ کسی طرح چند لمحوں کے لیے اس کی کار کو روکا جائے۔ ان تینوں کاروں نے آخر کار اس کی کار کو روک تو نہیں پائے لیکن رک جانے کی حد تک آہستہ کر ہی لیا۔ جیسے ہی خورشید خان کی کار آہستہ ہوئی، جنید نے انتہائی پھرتی سے اپنی کار کا دروازہ ذرا سا کھولا اور نیچے کی طرف کر کے سائیلنسر لگے پسٹل سے ٹائر پر فائر کر دیا۔ جیسے ہی ٹائر پھٹنے کی آواز آئی، اس وقت تک جنید نے پسٹل اندر کر کے دروازہ بند کر لیا تھا۔ جیسے ہی خورشید خان کے ڈرائیور نے کار آگے بڑھائی تو اسے پتہ چل گیا کہ ٹائر مسئلہ کر گیا ہے۔ اس کی کار ذرا سی لہرائی پھر کار سڑک میں رُک گئی۔ اس سے ٹریفک بلاک ہو گئی۔ ان کی تینوں کاریں خورشید خان کی کار کے اردگرد ہو گئیں۔ خورشید خان کا ڈرائیور کار سے اتر آیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب جنید حرکت میں آ گیا۔ سبھی اپنی اپنی کاروں سے اتر آئے تھے۔ جنید نے جیسے ہی پچھلا دروازہ کھولا، وہ سبھی اس طرف دیکھنے لگے۔ جنید نے پسٹل خورشید خان کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے سکون سے کہا۔

''میرے ساتھ آتے ہو یا یہیں مار دوں؟''

''ک.....کک.....کہاں؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ اتنے میں اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سیکورٹی گارڈ نے مڑ کر گن سیدھی تھی دوسری طرف سے اس کے سر پر پسٹل رکھ دیا گیا تو جنید نے کہا۔

''یار کسی اچھی جگہ چلیں گے، چلو، ایک، دو.....

''چلو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ نیچے اترنے لگا۔ جنید نے اسے اپنے ساتھ لیا اور اپنی کار میں آ بیٹھا۔ تب تک اس کا ڈرائیور ٹائر کا گیئر لگا چکا تھا۔ سائیڈ سے کاریں نکل رہی تھیں، اس نے زگ زیگ کاریوں نکالی کہ کمال کر دیا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ اس کی سیکورٹی کار ان کے پیچھے ضرور آئے گی۔ انہوں نے نہر سے اندر کی جانب ٹرن لیا اور تیز رفتاری سے چلنے لگے۔ انہیں پتہ چل گیا کہ وہ ان کے پیچھے ہیں۔ تبھی فہیم کی آواز اسے سنائی دی۔

''جنید! ان سے مارا ماری مت کرنا، فائر تو بالکل نہیں، یہ اس لیے کہ یہ علاقہ ایسا ہے تم پھنس جاؤ گے۔ انہیں جُل دے کر نکلنے کی کوشش کرو۔''

''اوکے۔'' جنید نے کہا تو اس کے ساتھ ہی ڈرائیور نے کار بھگا دی۔ اسے پتہ تھا کہ سب نے اس کی بات سن لی ہے۔ ایک دم ساری کاریں اکٹھی ہوئیں اور پھر الگ الگ ہو گئیں۔ سیکورٹی والی کار ایک دوسری کار کے پیچھے لگ گئی۔ جنید کے لیے راستہ

صاف ہوگیا۔ وہ بڑے اطمینان سے ماڈل ٹاؤن کے سیف ہاؤس میں پہنچ گیا۔

خورشید خان کو جب ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا گیا تو میں کیمرے کے ذریعے اسے دیکھنے لگا۔ میں نے جنید کے ذریعے اس سے سوال کیا۔ میں کہتا جا رہا تھا اور جنید اسے دہرا رہا تھا۔ وہ بات سننے کو بیتاب تھا۔

''سکندر خان کے دست راست راشد محمود سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

میرے سوال پر وہ بری طرح چونک گیا۔ مگر لمحہ بھر میں خود پر قابو پا گیا۔ اس نے جنید کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سکندر خان اور کون راشد محمود؟''

''جنید اس کی پٹائی کرو اور اس وقت تک کرتے رہو، جب تک یہ اس تعلق کے بارے میں نہ مان جائے، باقی باتیں صبح ہوں گی۔'' میں نے کہا اور جنید سے رابطہ منقطع کر کے گھومتے ہوئے دیکھا تو سوہنی میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ملگجی روشنی میں اس کا سفید رنگ دمک رہا تھا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں بھئی فہیم، اب باقی لوگوں کے بارے میں بتاؤ، کیا وہاں لوگ پہنچ گئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ سب اس آپریشن میں لگ گئے ہیں، چونکہ ہمارا ان سے رابطہ نہیں، اس لیے رپورٹ دیر بعد ملے گی۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا تو فہیم نے میری توجہ چاہنے کے لیے پوچھا۔

''آپ کے پاس کوئی ہے؟''

''تمہیں کیسے پتہ؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''پہلے آپ کنفرم کریں، تو......'' وہ کہتے ہوئے رُک گیا تو میں نے اسے سوہنی کی موجودگی کے بارے میں بتا دیا، تب وہ بولا۔

''یہ میں آپ کو ایسے نہیں بتا پاؤں گا۔ آپ کو میرے پاس آنا ہوگا۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھئی، میں اتنے دنوں بعد اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوں اور تم رقیبوں کی طرح درمیان میں خلل ڈال رہے ہو۔'' میں ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ میری ایک بڑی کامیابی ہے، جو میں سب سے پہلے آپ کو بتانا چاہ رہا تھا۔ چلیں صبح تک انتظار کر لیتا ہوں۔'' اس نے یوں کہا جیسے مایوس ہو گیا ہو۔ سو میرے کہنے سے پہلے ہی سوہنی نے کہا۔

''فہیم! اس وقت تمہارے پاس کون کون ہے؟''

''میں، ارونداور مہوش۔'' اس نے کہا۔

''اوکے، ہم دس یا پندرہ منٹ تک تمہارے پاس آ رہے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں نے سوہنی کی جانب دیکھا وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور ایک ملازمہ سے بہترین چائے بنانے کو کہا۔

جب تک ہم کچن کے پاس پہنچے، چائے تیار تھی۔ سوہنی نے فریج میں سے مٹھائی نکالی اور وہ ٹرے میں رکھتے ہوئے ملازمہ سے چائے رکھنے کو کہا۔ اگلے چند منٹ میں ہم ان کے پاس تھے۔

''ہاں بولو کیا کامیابی ہے۔'' سوہنی اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی، ارونداور مہوش بھی متوجہ ہو گئے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بتانے لگا

''آپ کو یاد ہوگا کہ بھارت میں کسی نے بدن کی گرمی اور ان دیکھی شعاعوں کو ایک ٹریگر کے طور پر استعمال کرنے کا سوفٹ ویئر بنایا تھا، پھر ہم نے اسی سے اُن لوگوں کو پکڑا تھا۔''

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' میں نے کہا تو وہ تیزی

سے بولا۔

"یہ دیکھیں، میں نے ایک سوفٹ ویئر بنایا ہے، اس کی بنیادی تھیوری یہ کہ جس طرح بظاہر انسان ایک جیسا ہی ہے، لیکن قدرت نے اسے انفرادیت بھی دی ہے۔ جیسے انگوٹھے کا نشان، جسم کی شعاعیں وغیرہ۔ ہر انسانی جسم کی کیمسٹری الگ ہے۔ اس طرح اگر اس سوفٹ ویئر میں کسی بھی شخص کی آواز داخل کر دی جائے تو پھر وہ آواز جب تک دنیا ہے ختم نہیں ہو جاتی، اس وقت تک وہ آواز والا بندہ ہماری نگاہ سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔"

"اوئے فہیمے تیری...... مجھے بتایا ہی نہیں۔" اروند سنگھ نے چونکتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"اس لیے کہ تو اسے چیک کر، اب اسے اپ ڈیٹ کر، اگر ہو سکے تو۔" فہیم نے فخریہ انداز میں کہا۔

"پر تجھے میرے چھت پر ہونے کا اندازہ کیسے ہو گیا، میں تو بولی ہی نہیں وہاں پر؟" سوہنی نے الجھتے ہوئے کہا۔

"میں نے یہاں جتنے فرد ہیں ان سب کی آوازوں پر ہی تو تجربہ کیا ہے، آپ کی آواز بھی اسی میں ہے، سو، مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ کہاں ہو۔"

"بے شک یہ تمہاری بڑی کامیابی ہے۔" مہوش نے اس کے پاس آ کر بال بگاڑ دیئے۔ یہ اس کا خلوص بھرا انداز تھا۔ تبھی اس نے کہا۔

"کاش یہاں گرلین اور رونیت ہوتیں، انہیں کتنی خوشی ہوتی۔ انہیں بھی بتائیں۔"

"انہیں بھی معلوم ہو جائے گا، کل تک وہ بھارت پہنچ جائیں گی، اس وقت وہ جہاز میں ہوں گی۔" میں نے کہا تو وہ سمجھ گئی کہ انہیں تو چلے جانا تھا۔

"اوہ! کل بتا دیں گے۔" مہوش نے کہا۔

"مبارک ہو فہیم، رب تجھے بہت ترقی دے۔ کل تمہارے اعزاز میں پارٹی ہوگی، یہیں پر۔" میں نے کہا تو وہ سب خوش ہو گئے۔ ابھی وہ سارے اس سوفٹ ویئر کو سمجھ رہے تھے کہ میں نے اروند کی توجہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"یار، جن لوگوں کی میں نے تمہیں لسٹ دی تھی، وہ سب......"

"ان کا آپریشن مختلف جگہ پر ہو رہا ہے، میں ان کے ساتھ ہوں۔ مجھے اطلاع مل رہی ہے۔ چاہے چھ سات بندے ہی ہیں، لیکن سب مہان قسم کے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں، میں سب سنبھال لوں گا۔" اس نے مجھے یقین دلایا تو میں ان کے پاس سے اٹھ کر بیڈروم کی طرف چل دیا۔ میں نے ان سب سے صبح بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو ملجگا اندھیرا تھا۔ میں فریش ہو کر جب واپس بیڈ پر آیا تو سوہنی میرے لیے چائے بنا کر لا چکی تھی۔

"سوہنی۔ ! اب مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا، میں ذرا بزی ہوں۔" میں چائے کی چسکی لے کر کہا تو وہ میری بات سمجھتے ہوئے مسکرا کر چلی گئی۔ جب تک چائے کی پیالی ختم ہوئی اس وقت تک میں سب سے رابطہ کر چکا تھا۔ جنید نے رات خورشید خان کی کافی دھنائی کی تھی۔ صبح سے پہلے وہ سب مان گیا تھا۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ تمہیں راشد نے نہیں بتایا؟" میں نے سوال کیا۔

"تین دن سے اس کے ساتھ رابطہ نہیں ہے۔" اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

"وہ نور نگر بندے تم نے بھیجے تھے، راشد کے کہنے پر یا تمہاری اپنی کوئی دلچسپی تھی؟"

"راشد کے کہنے پر، وہ وہاں کچھ لوگ مروانا چاہتا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ وہی جانتا ہے، مجھے اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ یہ بندہ ہمارے نیٹ ورک کے لیے خطرناک ہے۔" اس نے صاف بتا دیا۔

"اب سمجھ گئے ہو کہ ہم تم سے کیا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا تو روہانسا ہوتا ہوا بولا۔

"میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، میں تو اس نیٹ ورک کا حصہ ہوں، مجھے وہ سب کرنا پڑتا ہے، مجھے معاف کر دیں آپ جو کہیں گے میں وہ کرنے کو تیار ہوں۔"

"وہ نیٹ ورک اب ختم ہو چکا ہے۔ تمہارے اکاؤنٹ سے جتنا پیسہ تھا، وہ نکال لیا گیا ہے۔ تمہیں صرف اتنا کہا جا رہا ہے کہ ملک دشمنی میں اگر تم نے کوئی بھی کام کیا تو پھر بخشے نہیں جاؤ گے۔ بلکہ کوئی بھی ایسا کام ہو، تو اطلاع دینی ہے۔"

"جی میں ایسا ہی کروں گا، بس مجھے معاف کر دیں۔" اس نے کہا تو میں نے جنید کو اسے آزاد کرنے کو کہا۔ میں جانتا تھا کہ جنید اسے ایسے نہیں چھوڑنے والا، وہ اسے اس طرح وہاں سے بھیجتا کہ اسے پتہ ہی نہ چلے کہ وہ کہاں تھا۔ میں نے فرداً فرداً سب سے یہی بات کی انہیں آزاد کر دیا۔

میں نے ایک دفعہ سب کو معاف کر دیا۔ ان میں جو بھی سانپ فطرت والا ہوگا، اس نے ڈنگ ضرور مارنا تھا، اس کے لیے پھر معافی نہیں تھی۔ اسی لمحے میں نے راشد عرف گارڈ فادر کو فون کیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ تیزی سے بولا۔

"مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ جب میں تمہیں اپنا سارا نیٹ ورک دے رہا تھا، تم نے نہیں لیا۔ اب انہیں لوٹ رہے ہو، اور نیٹ ورک تباہ کر رہے ہو، اس سے تمہیں کیا فائدہ ہے میری جان؟"

"تم لوگ انسانیت کے لیے کام نہیں کر رہے ہو، تم لوگوں کا مقصد شیطانیت ہے، جو مجھے قبول نہیں۔ جو بھی میرے ملک کے لیے غلط کرے گا، میں اسے حرف غلط کی طرح مٹا دوں گا۔"

"جو کچھ تم ختم کر چکے ہو، یہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے، تمہارے حکمرانوں نے، سیاست دانوں، مذہبی لیڈروں، سوشل ورکروں نے تمہارے ملک کو تماشہ گاہ بنا دیا ہے۔ کیا کرو گے، بہت وقت چاہیے اور بہت بڑی قوت، اور تم ایسے بھی نہیں ہو کہ بقول تمہارے، میرے جیسے مہرے کو بھی ختم نہیں کر پائے۔ میں زیادہ سے زیادہ دو ہفتے بعد پھر نمودار ہو جاؤں گا۔ پوری دنیا تک رسائی ہے میری۔" اس کا لہجہ مضحکہ خیز تھا۔

"تو پھر تم نے میری رسائی دیکھنی ہے؟" میں نے پوچھا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اچانک اس کا قہقہہ بند ہو گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا، "یہ کیا ہے ڈیورا؟"

"تمہاری موت۔" اس نے کہا اور فائر کر دیا۔ گارڈ فادر کے منہ سے بھیانک آواز نکلی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گر گیا تھا کیونکہ فون گرنے کی آواز آئی تھی۔ اس کے کچھ ہی لمحوں بعد ڈیورا نے کہا۔

"یہ ختم ہو چکا ہے۔"

"تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ یہاں سے نکلو گی تو سرخ مرسڈیز میں میری وہی ساتھی بیٹھی ہوئی ہو گی، جس سے تم ملی تھی۔ وہ تمہاری ہر خواہش پوری کر دے گی۔" میں نے اسے سمجھایا

"او کے، میری اس کے ساتھ ڈیل ہو چکی ہے۔ مجھے پاسپورٹ مل گیا ہے۔" اس نے کہا اور فون بند کر

دیا۔ میں تانی کی سوچ کو داد دیئے بنا نہیں رہ سکا اس نے کس خوبصورتی سے راشد کو ڈیورا کے ہاتھوں ہی ختم کرا دیا۔ ایک بڑی ڈیل اور کسی بھی دوسرے ملک میں رہنے کا وعدہ ڈیورا کے لیے اتنا اہم نہیں تھا، جتنا اس نے اپنی آزادی کے لیے کیا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور فون بند کر دیا۔ میں چند منٹ بیڈ پر بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر کھڑکی میں آ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ شام ہونے میں ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ میرا دل کیا کہ میں کہیں باہر نکلوں۔ میں نے کار نکالی اور مسافر شاہ کے تھڑے کی جانب چل پڑا۔

تھڑے پر درختوں کے نیچے پانی کا چھڑکاؤ کیا ہوا تھا۔ رنگین پایوں والی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے کار روکی اور اتر کر کمروں کے پیچھے دیکھا تو اکھاڑہ تھا۔ میں فرید اور درویش دونوں زور کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ دو اور پہلوان بھی زور آزمائی کر رہے تھے۔ انہیں دیکھنے کو کچھ لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں خاصی رونق لگی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے رک گئے۔ میں نے انہیں اپنا کام جاری رکھنے کو کہا اور وہاں سے پلٹ کر مسافر شاہ کے تھڑے پر چلا گیا۔ میں اس وقت واپس لوٹا، جب شام ہو رہی تھی اور وہ زور آزمائی ختم کر کے سردائی رگڑنے لگے تھے۔ اس وقت میں ان کے پاس چارپائی پر جا بیٹھا۔ پہلوان مٹی کے بڑے بڑے پیالوں میں سردائی پی رہے تھے۔ ایک پیالہ مجھے بھی دیا۔ میں نے سردائی پینے کے بعد اس درویش سے فرید کے بارے میں پوچھا۔

''سناؤ کیا حال ہے اس کا؟''

''اب یہ فتح کی راہ پر آیا ہے، سمجھ لو کہ برتن کو آگ میں رکھ دیا ہے، اب اس نے پختہ ہونا ہے۔'' اس نے رمزیہ انداز میں کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کھل کر کہو بابا، اصل بات کیا ہے؟'' میں نے جان بوجھ اس سے فرید کی حالت کے بارے میں پوچھا۔

''اصل بات تو شوق ہی نا سرکار۔ اس کا شوق اسے پہلوانی کی طرف لے تو آیا لیکن یہ انتہائی کچا تھا۔ یہ کچھ نہیں جانتا تھا، اسے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ اس کے اندر کتنی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ اس نے خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ خیر اسی سے پوچھو، یہ کن مرحلوں سے گزرا ہے۔'' اس نے فرید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا میں نے فرید کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا، پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ پہلوانی اتنی مشکل ہوتی ہے۔ میں اکیلا ہی یہاں اکھاڑا کھودلیتا زور کر لیتا اور بس۔ پھر جب یہ درویش یہاں آئے تو مجھے پتہ چلا کہ یہ خود بھی اپنے دور کے بڑے پہلوان رہے ہیں۔ ان کے یہاں آتے ہی یہ پہلوان یہاں آ گئے۔ دو دن ہی میں مجھے پتہ چل گیا کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، انہوں نے میرا بدن توڑ کر رکھ دیا۔ میرے اندر یہ سوچ پیدا ہو گئی کہ میں کس کام میں آ پڑا ہوں۔ میں ٹوٹ گیا تھا، میری ہمت ہی جواب دے گئی تھی۔ ایک شام میں دل برداشتہ ہو کر اکھاڑے سے آیا۔ لیکن میرا شوق مجھے اس راہ سے ہٹنے نہیں دے رہا تھا، ساری رات میں اسی کشمکش میں رہا، صبح میں پھر اکھاڑے جا پہنچا۔ تب انہوں نے مجھے داؤ سکھانا شروع کر دیئے اور اب میں ان سب پہلوانوں پر بھاری ہوں۔ بڑے آرام سے انہیں زیر کر لیتا ہوں۔''

''شوق سب سے اہم شوق ہے۔ اس کے شکستہ بدن نے اس کے اندر یہ سوچ پیدا کی کہ میں کس کام میں پڑ گیا ہوں، یہ پستی کی دلیل ہے۔ یہ گرا تو اس

کے شوق نے اس کے اندر بلندی پیدا کردی۔ اصل میں پستی اور بلندی سے گزر جانے کے بعد ہی مقام فتح نصیب ہوتا ہے۔ جب تک کوئی گرتا نہیں ہے، اسے بلندی کی سمجھ نہیں آتی۔ شوق ہی کمزوری کی دلیل کو اڑاتا ہے اور تسخیر کے مقام پر فائز کرتا ہے۔ جس نے خود اٹھنے کا راز پالیا وہی ساری قوتوں کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شکستہ ہونا، گرنا، اٹھنا، عمل میں آنا، داؤ سیکھنا، شہ زور بننا، تسخیر کرنا یہ سب شوق ہی کے مراحل ہیں۔'' درویش نے بڑے سکون سے مجھے فرید کے بارے میں سب بتا دیا۔ میں مسکرا دیا۔ جبھی میں نے ان سب کی طرف دیکھ کر انہیں وہ بات سمجھائی جو بہت ضروری تھی۔

جب بیج زمین کی تاریکی میں چلا جاتا ہے تو تنہائی میں اس کی آنکھ بند ہوجاتی ہے۔ پھر وہ اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ کائنات سے اس نے آنکھ بند کرلی اور وہ آنکھ اس نے اپنے آپ پر کھول لی۔ وہ اپنے آپ میں گم ہوگیا۔ اسے اپنے آپ کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی خلوت میں جاکر اس نے خود پر نگاہ کی۔ اس وقت بیج کو اپنے بارے میں پتہ چلا کہ اس کے اندر کیا کچھ پڑا ہے، وہ کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ جب وہ خود کو سمجھتا ہے تو اس کے اندر قوت پیدا ہوتی ہے۔ اب بیج کے پاس دو ہی قوتیں ہیں۔ ایک مٹی، دوسرا نمی۔ دوسرے لفظوں میں اسے صحبت اور نگاہ بھی کہہ سکتے ہیں جب خود پر نگاہ مرکوز ہوئی، اسے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا تب یہی صلاحیتیں اس کے اندر قوت بیدار کردیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ خود کو چیر دیتا ہے، زمین کی تاریکی کو بھی پھاڑ دیتا ہے اور خلوت سے جلوت میں آجاتا ہے۔

اصل میں جب اس نے خود پر آنکھ کھولی تھی، اسی وقت ایک تناور شجر بننے کا عمل اس میں شروع ہوگیا تھا۔ جب تک اس کی خود پر نگاہ نہیں گئی تھی، وہ اس عمل میں نہیں آیا تھا۔ یہ اس کے اندر کی قوت ہی تھی جو بیدار ہوئی تھی۔ 'محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے..... ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے۔'

یہ ذرا سا ذرہ ایٹم، جب ایٹم بم کی صورت میں پھٹتا ہے تو اس کے اندر کس قدر قوت بیدار ہوچکی ہوتی ہے۔ یہ انرجی ثابت کرتی ہے کہ اس کے پھٹنے سے کتنی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور جس نے اس ایٹم کو پھاڑا، اس کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟ وہ انسان، جس نے اتنا کچھ کرلیا، اور نجانے اس سے کیا کچھ ظہور ہوتا ہے، وہ اپنی جانب دیکھ ہی نہیں رہا۔ جس نے اپنے اندر دیکھ لیا، اس نے قوتوں کا منبع سر کرلیا۔ طریقہ یہی ہے کہ اسے خلوت میں جانا پڑے گا۔

انسان ایک جسم ہے، جو مٹی سے بنا ہے اور اس کا تعلق کائنات سے ہے۔ اس کا وجود مٹی اور کل کائنات اس کا وجود ہے۔ اس کائنات میں جو سوچ اور فکر ظاہر ہورہی ہے وہ انسان ہی کی تو ہے کہ کس طرح وہ اپنے پروردگار کی دی ہوئی نعمتوں کو تصرف میں لا رہا ہے، کیسے کیسے تسخیر کر رہا ہے۔ انسان کے اس وجود میں دل پڑا ہوا ہے جو تمام قوتوں کا منبع ہے۔

انسان کے ظاہری جسم کا تعلق اس کائنات سے ہے۔ جہاں سے وہ اپنی تمام ضرورتیں پوری کر رہا ہے۔ وہ اپنی ضرورت کے تحت ہر شے نکال رہا ہے۔ وجود کی ضرورت پوری ہورہی ہے۔ ایک علم اس کے دل میں پڑا ہے اس کا دل جو ہے وہی دین ہے۔ علم دو ہی ہیں، ایک علم دین ہے اور ایک علم ابدان۔

یہ انسان ہی کا ظہور ہے جو اس کائنات میں ترقی ہورہی ہے۔ مالک کائنات نے تو اسے پورا بنا دیا، ترقی کا مطلب، انسان کی اپنی ترقی۔ جو دل ہے وہ ہماری

غیرت ہے، وہی ہمارا دین ہے۔ اگر یہ نہ رہا تو پھر کچھ بھی نہ رہا۔ کیونکہ دل میں سے جا کر ظاہر ہونے والا ہی مومن ہے۔ دین اور دنیا، ظاہر اور باطن ایک نظام میں لائیں گے تو وہ دل کے تابع ہوگی عقل اگر دل کے تابع ہے تو وہ یزدانی اگر نہیں تو نری شیطانی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دل کے ساتھ جڑا کیسے جائے، تو سیدھی سی بات ہے کوئی نہ کوئی معیار لینا پڑے گا، کوئی صورت لینا ہوگی جو دل کے بھید سے واقف ہے جب سامنے مومن ہوگا تو حقیقت کھل جائے گی۔ باطن کا مطلب فقر ہے۔ اصل میں دل کا راز ہے غیرت واز فقر، سامنے فقر لینا ہوگا، کوئی ہدف کوئی نشانہ تو لینا ہوگا۔ پھر تسخیر کا مقام خود بخود ہاتھ میں آجاتا ہے۔ کیونکہ دل کی سوچ ہی مومن سے پیدا ہوتی ہے۔ مومن ہی محرم راز دل ہے۔ سوچ فقر ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پہلوانوں نے کھانا بنایا ہوا تھا، میں نے ان کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر واپس حویلی کی جانب چل پڑا۔ میں بہت مسرور تھا۔ مسافر شاہ کے ٹھڑے پر رونق لگ گئی تھی۔

☆......☆......☆

جسپال سنگھ کو چندی گڑھ پہنچتے ہوئے تین دن لگ گئے۔ سردار سرجیت سنگھ بندیال کی دی ہوئی معلومات اور نیٹ ورک کے ساتھ رابطہ مکمل کر لیا۔ بھارتی پنجاب کے ہر بڑے شہر میں ایک ایسا بندہ موجود تھا، جس کا پورے علاقے میں نیٹ ورک تھا۔ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ فہیم اور اروند سنگھ کے ساتھ مل کر ایسا مربوط رابطہ بنایا تھا کہ انہیں جو کام بھی کرنا تھا، اس سے ہر بندہ با خبر رہتا۔ اس دوران اس نے گاڈ فادر کے اس پورے نیٹ ورک کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کر لی

تھی جو بھارت میں پھیلا ہوا تھا۔ مگر اسے دلچسپی بھارتی پنجاب سے تھی، اس لیے اس کا کام جلدی سمٹ گیا۔ اس کے ساتھ بانیتا کور تھی۔ دونوں سیکٹر انیس میں ایک بنگلہ نما گھر میں جا پہنچے جہاں سندیپ کور اور نوتن کور پہلے ہی سے موجود تھیں۔ رونیت اور گرلین ابھی تک نہیں پہنچی تھیں۔ اس دن وہ تھائی لینڈ میں تھیں، جہاں سے انہیں بھارت آنا تھا۔

چندی گڑھ میں انسانی حقوق کی ایک تنظیم موجود تھی، یہ سارا نیٹ ورک اسی کے گرد گھومتا تھا۔ چندی گڑھ ہی میں موجود ایک نوجوان رکن اسمبلی جگتار سنگھ اس تنظیم کو چلا رہا تھا۔ یہ تنظیم اس وقت سے قائم تھی، جب اس نے سیاست میں قدم بھی نہیں رکھا تھا، طلبہ سیاست اور تنظیموں میں اس نے اپنا آپ منوایا۔ پڑھائی کے بعد اس نے کسی سیاسی جماعت کو جوائن نہیں کیا بلکہ انسانی حقوق کی تنظیم بنالی۔ بنیادی طور پر وہ انسانی حقوق کی ہی تنظیم تھی لیکن اس کی تمام تر قوت خالصہ تحریک تھی۔ وہ خالصہ حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس کے لیے جگتار سنگھ نے کئی بار بھارتی پنجاب کا دورہ کیا تھا۔ تقریباً آٹھ برس کی محنت کے بعد اسے سیاسی طور پر استحکام ملا اور وہ اسمبلی میں پہنچ گیا۔ اسے اس مقام تک لانے میں انتہائی خفیہ طور پر سردار سرجیت سنگھ بندیال نے ہی مدد دی تھی۔ جس وقت سردار سرجیت سنگھ بندیال نے جسپال سنگھ پر تمام تر ذمہ داری ڈال دی، تبھی اس نے ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس کی کہ جو سامنے آسکے۔ جب وہ رابطہ کاری پر کام کر رہا تھا، اس وقت اس کے سامنے سردار جگتار سنگھ ہی کا نام ہی آیا۔ جسپال کا اس سے رابطہ ہو چکا تھا اور اس دوپہر اسی جگتار سنگھ سے ملاقات طے تھی۔

وہ چندی گڑھ سیکٹر چونتیس میں پانچ منزلہ بلڈنگ

کچھ کر سکتا ہوں، یا میں اب بھی چاہوں تو میں یہاں سے بڑے آرام کے ساتھ جا سکتا ہوں۔ مجھے یہ باتیں نہیں کرنی۔ میں کچھ اور ہی باتیں کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''کہو، میں سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جمال، میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ میں تمہیں خود یہاں تک لے کر آیا ہوں۔ ایلکس کا بیٹا نام ابھی اتنی حیثیت نہیں رکھتا کہ وہ کوئی عالمی گیم کر سکے۔ اس کے پیچھے کچھ دوسرے لوگ ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کا تجربہ کامیاب ہو۔ وہ اب بھی کام کر رہے ہیں لیکن بہت جلد ختم ہو جائیں گے، میں تمہیں اس سے پہلے کا جانتا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ میں یہ تعلق داری کیوں رکھنا چاہتا ہوں؟'' اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے، یہ سوال تو بنتا ہے۔'' میں بولا۔

''اس سوال کا جواب دینے سے پہلے، میں تمہیں اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میری سرگزشت میں تمہیں جواب مل گیا تو ٹھیک، ورنہ میں صاف انداز میں بتا دوں گا۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میں سن رہا ہوں۔'' میں نے صوفے پر پھیلتے ہوئے کہا تو وہ بھی ایزی ہو گیا۔

☆......☆......☆

میرا نام راشد محمود ہے۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا ہوں۔ میرے ایک تایا تھے، جن کی اولاد میں تین بیٹیاں اور بیٹا صرف ایک ہی تھا۔ دو بڑی تھیں اور زینت مجھ سے چھوٹی تھی۔ میرا تایا صفدر علی، مجھے سے بڑا پیار کرتا تھا۔ چونکہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے، اس لیے بچپن ہی سے میں اپنی کزن کو بہنیں ہی تصور کرتا تھا۔ بڑے ہی خوشگوار ماحول میں زندگی گزر رہی تھی۔ لاڈ پیار اور محبت میں ہماری پرورش ہوتی رہی اور ہم سکون سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے بڑھتے گئے۔

ہوا یوں کہ میں نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میں اپنی مستی میں رہنے والا بندہ تھا۔ میں اپنی موج میں رہتا تھا۔ نہ مجھے طلبہ سیاست سے کوئی غرض تھی اور نہ مذہبی طلبہ تنظیموں سے کوئی مطلب۔ ہاسٹل میں میرے چند ہی کلاس فیلو دوست تھے۔ انہی کے ساتھ خوش تھا۔ میری پڑھائی کا ایک برس گزر گیا۔ اس دوران صرف ایک واقعہ ہوا۔ وہ یہ تھا کہ طلبہ تنظیم جو خود کو مذہبی تنظیم بھی گردانتی تھی، ان کے چند لوگ میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے چندہ مانگا۔ مجھے یہ تو پوری طرح پتہ تھا کہ یہ چندے کے نام پر بھتہ ہے جو ہر طالب علم سے وصول کیا جاتا ہے۔ میں نے چند روپے انہیں دے دیئے۔ انہوں نے اپنے پاس لسٹ دیکھی، میں جو چندہ دے رہا تھا، وہ اس لسٹ میں درج رقم سے کہیں کم تھا۔ مجھے اتنے ہی دینے کے لیے کہا گیا تو میں نے دینے سے یکسر انکار کر دیا۔ انہوں نے فوری طور پر کچھ نہیں کہا۔ واپس چلے گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلے برس میری کزن زینت نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تو اس کی تمام تر ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی۔ جسے میں نے خوشی قبول کر لیا۔

یونیورسٹی میں وہ میرے دوسرے برس کے آخری ایام تھے۔ میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ ہاسٹل میں اسی طلبہ تنظیم کا جو پہلے والا عہدیدار تھا، وہ بدل گیا، اس کی جگہ نیا آ گیا تھا۔ وہی نیا عہدیدار اپنے ساتھ چند لڑکوں کو لے کر آ گیا۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے مجھے کہا کہ تمہاری طرف اتنا چندہ بنتا ہے جو تم نے دو برس میں ادا نہیں کیا۔ اس لیے دو دنوں میں وہ چندہ دے دو، ورنہ تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے، تمہارے تصور میں بھی نہیں ہو گا۔ میں نے

میں نے سب کو الرٹ کر دیا اور اس وقت ہم اس کے گھر کے قریب ایک ریستوران میں جا بیٹھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جس طرح وہ کل سے اپنی جگہ تبدیل کر رہا ہے، وہ ضرور یہاں سے بھی نکلے گا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ لندن میں بھی طبقاتی بندی ہے۔ گورے ایک ہی علاقے میں رہنا پسند کرتے تھے اور ان میں خال ہی کوئی غیر گورا ہوتا اور ایسے علاقے جہاں ایشیائی لوگ رہتے تھے وہاں خال ہی کوئی گورا دکھائی دیتا تھا۔ اس ریستوران میں بھی مجھے کوئی ایشیائی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ہم وہاں بیٹھے بالکل الگ سے دکھائی دے رہے تھے، یہ خطرناک بات تھی۔ ہمیں وہاں ایک گھنٹے سے زیادہ بیٹھنا پڑا۔ تبھی مجھے پتہ چلا کہ وہاں اس گھر سے ایک ایسا شخص پیدل نکلا ہے۔ جیسا میں نے انہیں بتایا ہوا تھا۔ میں بھی ریستوران سے باہر آ گیا۔ میرے ساتھ جنید تھا۔ میں نے دیکھا وہ سڑک کے پار گلی کے سرے پر تھا۔ وہ دائیں طرف سڑک کے فٹ پاتھ پر مڑ گیا اور چلنے لگا۔ میں نے سڑک پار کی اور کچھ ہی دیر بعد اس کے قریب جا پہنچا۔ جیسے ہی میں اس کے برابر چڑھا، اس نے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر کہا۔

''میں جانتا تھا کہ تُو مجھے تلاش کر لے گا۔ میں نے چھپنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے، اس لیے سکون سے رہو۔ میں تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے چلتے ہوئے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کہاں باتیں کریں۔'' میں نے پوچھا۔

''جہاں تم چاہو۔'' اس نے جواب دیا

''میرے ساتھ چلو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل۔'' اس نے جواب دیا۔

''آؤ پھر۔'' میں نے کہا اور رُک گیا۔ وہ بھی رُک گیا۔ میں نے جنید کو اشارہ کیا۔ وہ کار قریب لے آیا، جس کی ڈرائیونگ وہاں کا ایک مقامی پاکستانی نژاد کر رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا اور ہم چل پڑے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

کسی بھی ہنگامی صورت حال کے لیے، وہاں کے لوگوں نے ایک جگہ بنائی ہوئی تھی۔ جہاں کسی کو بھی لے جا کر پوچھ تاچھ کی جا سکتی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک ایسے علاقے میں آ گئے جہاں بہت کم آبادی تھی۔ اس دوران، ہم یوں خاموش رہے، جیسے ہمارے درمیان اعصابی جنگ چل رہی ہو۔

وہ کسی لارڈ کا قلعہ نما گھر تھا۔ جہاں سوائے چند لوگوں کے کوئی نہیں رہتا تھا۔ وہ لارڈ نجانے کب کا اسے بیچ گیا تھا۔ وہ زندہ تھا یا نہیں، کسی کو معلوم نہیں تھا۔ پورچ میں کار سے اترے تو داخلی دروازے کے پاس چند لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گاڈ فادر داخلی دروازے کے باہر ہی کھڑا ہو گیا اور بازو اٹھا دیئے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اپنی تلاشی دینا چاہتا تھا۔ وہ لوگ آگے بڑھے، انہوں نے تلاشی لی اور وہ راہداری میں چلا گیا۔ میں اس کی اس قدر تابعداری کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک جنٹلمین کی طرح اپنا کوٹ اتار دیا۔ پھر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ وہاں پر موجود ایک شخص نے سامنے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کیا۔ جو کافی بڑی تھیں۔ ہم اس پر چڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک ایسے کمرے میں آ گئے، جس کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا اور اسی کھڑکی سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ ہم صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس نے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

''جمال! میں تم پر یہ رعب جھاڑنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ میں کتنا طاقت ور ہوں اور میں کیا

تھی۔ جس کی پانچویں منزل پر جگتار سنگھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جسپال جیسے ہی لفٹ سے نکلا، اسے راہداری سنسان دکھائی دی۔ وہ مطلوبہ دروازے پر پہنچا ہی تھا اور ابھی دستک نہیں دی تھی کہ دروازہ کھل گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس عمارت میں خصوصی آلات لگے ہوئے ہیں، ظاہر ہے جو تحفظ ہی کی خاطر ہو سکتے ہیں۔ اس کے سامنے ایک روایتی سکھ جوان کھڑا تھا، جس نے سنہری فریم والی عینک لگائی ہوئی تھی۔ میرون رنگ کی پگڑی اور سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ست سری اکال جسپال سنگھ جی، میں جگتار سنگھ۔"

"ست سری اکال۔" جسپال نے دھیمے سے کہا۔

"آیئے۔" اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا تو جسپال آگے بڑھ گیا۔ وہ اسے اندر کمرے میں لے گیا۔ وہ کافی کشادہ فلیٹ تھا۔ وہ کمرے میں سامنے پڑے ایک صوفے پر جا بیٹھا تو جگتار سنگھ بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی کے بعد جگتار ہی نے کہا۔

"سردار سرجیت سنگھ بندیال جی کا بہت شکریہ کہ انہوں نے اس تنظیم میں اک نئی روح پھونک دی۔ میں جانتا ہوں کہ میں صرف دکھاوے کے لیے سامنے ہوں گا، اصل کام تو آپ نے کرنا ہے۔ آپ جو بھی میرے ذمے لگائیں گے، میں حاضر ہوں گا۔"

"جگتار سنگھ جی! آپ یہ ذہن میں بات بٹھا لیں کہ ہم میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑھا، یہ گرو مہاراج جانتے ہیں کہ کون سکھی کے ساتھ کتنا مخلص ہے۔ میں نے نہ آپ کے لیے کچھ کرنا ہے اور نہ آپ نے میرے لئے، اس لیے کسی کا کسی پر کوئی احسان نہیں ہے۔ کوئی بھی تحریک لہو مانگتی ہے، اور سکھ ہمیشہ لہو دینے کو بے تاب ہوتا ہے۔ کس نے کہاں کون سا کام کرنا ہے، اصل بات یہی ہے۔" جسپال نے بڑے تحمل سے کہا۔

"میں اصل میں کہنا یہی چاہ رہا تھا کہ جو آپ فیصلہ کر کے مجھے بتائیں گے میں پوری تندہی سے کروں گا۔" جگتار نے پھر سے یقین دہانی کرا دی۔

"چلو کام کی ہی بات کرتے ہیں۔" جسپال نے کہا۔ تو جگتار ہمہ تن گوش ہو کر بولا۔

"جی ضرور۔"

"تم جانتے ہو کہ سا کا چوراسی کے بعد اور اندرا گاندھی قتل کے بعد سکھ نوجوانوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا۔" جسپال نے یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا، جہاں اسے درد محسوس ہوا۔

"ہاں، فوج اور ہندو گماشتے راتوں کو گاؤں میں داخل ہو جاتے اور چن چن کر نوجوانوں کو نکالتے اور انہیں گولیوں سے مار دیتے۔" جگتار نے نفرت سے کہا۔

"اسی تناظر میں سکھ نوجوانوں ایک بہت بڑی تعداد دوسرے ملکوں کی طرف بھاگ گئی۔ جہاں ان کی ایک عمر گزر گئی، ان کی نئی نسل جوان ہو گئی۔ جیسے جیسے وقت گزرا ان کے اندر اپنی تذلیل، سکھ قوم کا قتل اور جلاوطنی کا انتقام بھی بڑھتا گیا۔ اب وہ لوگ واپس نہیں آ سکتے، ان کی نسل نے وہ ظلم نہیں دیکھا، لیکن وہ بھارت میں موجود سکھوں سے یہ امید ضرور کر رہے ہیں کہ وہ سکھی کے لیے وہ سب کریں جو کرنا چاہئے، اس کے لیے انہوں نے دولت کا رخ اس طرف کر دیا ہے، مگر افسوس، کئی ایک سکھ تنظیمیں، اس دولت کا ناجائز استعمال کر رہی ہیں۔ ہمارا سب سے پہلا کام یہی ہے کہ ایسی تنظیموں کو تلاش کیا جائے اور انہیں ختم کیا جائے۔" جسپال نے اسے سمجھایا۔

"جی، یہ میں نے بھی محسوس کیا ہے، آج سے یہ کام شروع سمجھیں۔" جگتار سنگھ نے کہا۔

"دوسری بات یہ ہے کہ سکھی پنجاب سے جڑی ہوئی ہے، پنجاب کی ثقافت کو کسی دوسرے رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے، یوں جیسے سکھ صرف گانے بجانے والے لوگ ہی ہیں، ایک فلم پروڈکشن بنانی ہوگی جو پنجاب کو اس کا اصل رنگ دے کر پیش کرے۔"

جسپال نے سنجیدگی سے کہا تو وہ پرجوش لہجے میں بولا۔

"بہت عرصے سے میرے ذہن میں یہی خیال تھا، میں تو اس حد تک سوچ رہا ہوں کہ صرف فلم ہی نہ بنائی جائے، اس کا اصلی کام وہ ڈاکومینٹریز ہوں جس میں ایک طرف سکھوں کو ابھارا جائے تو دوسری طرف ان پر ہونے والے ظلم دکھائے جائیں۔"

"یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔" یہ کہہ کر جسپال چند لمحوں کیلئے خاموش ہوا پھر بولا۔

"تیسرا کام یہ کہ وہ لوگ جو سکھ تو ہیں لیکن غدار ہیں، وہ زندہ نہیں رہنے چاہئیں۔"

"ہاں میں کئی ایک ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو سکھی کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"مثلاً.....؟" جسپال نے پوچھا۔

"مثلاً بٹالہ میں ایک ایڈووکیٹ ہے منندر سنگھ، اس نے پورے علاقے کو اس طرح قابو کیا ہوا ہے کہ کوئی اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ یہ صرف سیاسی طور پر مستحکم ہونے اور پورے علاقے کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے وہ "را" کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ممکن ہے اس نے اپنا نیٹ ورک بھی بنا لیا ہو تاکہ مزید پھیلے۔" جگتار نے بتایا تو جسپال خاموش ہو گیا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

"اب میں چلتا ہوں۔ چند دنوں میں کوئی ثقافتی پروگرام رکھو۔"

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ وہ جسپال کو لفٹ تک چھوڑنے آیا۔

وہ واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا اور سب سے پہلے اس نے بٹالہ میں موجود بندے کو اس ایڈووکیٹ کے بارے میں پوچھا تو اس کے بارے میں اسے پوری معلومات تھی، جو اس نے اسی وقت بتا دی۔ منندر سنگھ ایڈووکیٹ شہر کا مشہور وکیل تھا۔ وہ لوگ تقسیم ہند سے پہلے کے وہاں آباد تھے۔ ان کا خاندان کافی اثر ورسوخ والا تھا۔ وہ بھنڈاری گیٹ کے قریب ایک حویلی میں رہتا تھا، جو ان کی آبائی حویلی تھی۔ منندر سنگھ سے پہلے وہ لوگ سیاست میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ مگر منندر سنگھ نے دلچسپی لی اور اپنے آپ کو منوا لیا۔ دراصل وہ کالج دور میں غنڈہ گردی کرتا رہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کا بگڑا ہوا لڑکا تھا۔ اس کی سرشت میں یہ شامل تھا کہ طاقت کے بل بوتے پر لوگوں کو دبا کر رکھے اور ان پر حکومت کرے۔ وہ مقامی سطح پر اس لیے بھی کامیاب تھا کہ "را" اسے اس طرح سپورٹ کرتی تھی۔ وہ سکھ تھا لیکن اس کا دراصل کوئی مذہب نہیں تھا۔ اس کا مذہب فقط دولت تھا۔ اس نے مقامی سکھوں کے بارے میں "را" کو پوری جانکاری دینے سے سکھ وہاں کبھی نہیں اٹھ سکے تھے۔ لہٰذا اس کا پتہ صاف کرنا بہت ضروری تھا۔

جسپال نے اس مقصد کے لیے ایک ٹیم بنائی ہوئی تھی۔ جو فقط ایسے ہی کام کرتے تھے۔ یہ ان کا پہلا امتحان تھا۔ وہ لوگ مختلف شہروں میں رہتے تھے۔ انہیں فوری طور پر صبح تک بٹالہ میں گردوارہ کندھ صاحب پہنچ جانے کو کہہ دیا۔ مقامی طور پر اس کی ریکی پر چند لوگوں کو لگا دیا۔

رات گئے تک دونوں اطراف سے خبریں پہنچتی

رہیں۔ وہ لوگ بھی جو کندھ صاحب پہنچ رہے تھے اور وہ بھی کہ مندر رنگھ کے معمولات کیا ہیں۔

بٹالہ شہر میں کندھ صاحب وہ گوردوارہ ہے جہاں گرونانک مہاراج شادی کرنے کے لیے بارات کے ساتھ گئے۔ وہ ایک کندھ (دیوار) کے ساتھ بیٹھ گئے جو کچی تھی اور کسی بھی وقت گر سکتی تھی۔ ایک بوڑھی عورت نے گرو نانک مہاراج کو بتایا بھی کہ یہاں مت بیٹھو، یہ دیوار کسی بھی وقت گر سکتی ہے۔ نانک دیومہاراج نے جواب دیا کہ یہ نہیں گرے گی کیونکہ یہ ہماری شادی کی گواہ ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ دیوار نہیں گری، یہاں تک کہ بہت سارا عرصہ گزر گیا۔ اس کی یاد میں یہ گردوارہ بنایا گیا، جہاں اب ہر سال میلہ لگتا ہے۔ وہ دو لوگ وہاں پہنچ گئے، جنہوں نے مندر رنگھ کا شکار کرنا تھا۔

رات کے آخری پہر جب گردوارہ سے گیانی بولنے لگا، لوگوں کو اٹھ جانے کی تلقین کرنے لگا، ایسے میں وہ دونوں گردوارہ سے باہر نکل آئے، انہوں نے چادریں لی ہوئی تھیں اور کافی حد تک منہ بھی ڈھانپ لیا ہوا تھا۔ ان کا رخ بھنڈاری گیٹ کی اس حویلی کی جانب تھا جہاں مندر رنگھ رہتا تھا۔

وہ حویلی پرانے طرز کی تھی اور ایک چھوٹی گلی میں تھی۔ وہی بڑا سارا سیاہ گیٹ اور دو منزلہ حویلی، جس کا طرز تعمیر تو پرانا ہی تھا لیکن اس پر رنگ و روغن اور دیکھ بھال کی وجہ سے کافی بہتر حالت میں تھی۔ گلی میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ وہ دونوں ایک موٹر سائیکل پر گلی کی نکڑ پر آن رکے۔ انہوں نے موٹر سائیکل ایک طرف لگایا اور آگے پیچھے چلتے ہوئے اس حویلی کے پاس جا پہنچے، جس کے آگے ایک مدقوق سا بلب روشن تھا۔ ان میں سے ایک نے چلتے ہوئے ایک پتھر اس بلب پر مارا تو بلب ٹوٹ گیا۔ روشنی بہت حد تک ختم ہوگئی، دور لگے ایک بلب کی ہلکی سی روشنی آنے لگی۔ گیٹ کافی مضبوط تھا لیکن انہوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ الماریوں، دریچوں اور ان کے بنے ہوئے ڈائزئنوں پر اپنے قدم جماتے ہوئے دیوار پر چڑھنے لگے۔ یہ ایک خاص طرح کی تربیت ہوتی ہے، جس کی مدد سے بڑی بڑی بلڈنگوں پر چڑھا جا سکتا ہے۔ تقریباً ایک منٹ میں وہ چھت پر بنی چاردیواری تک پہنچ گئے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ چھت پر تھے۔ وہاں کافی اندھیرا تھا۔ گردوارہ کے لاؤڈ اسپیکر سے آواز آ رہی تھی۔ وہ اس دروازہ کی جانب بڑھے جہاں سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔

وہ پہلی بار اس حویلی میں ہی نہیں اس شہر میں آئے تھے۔ انہیں صرف بتایا گیا تھا کہ مندر رنگھ کا کمرہ کہاں ہو سکتا ہے۔ وہ سیڑھیاں پہلی منزل کی چھت پر اتریں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ اسی طرح دوسرے کمرے تھے۔ لیکن ایک کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ وہ دبے پاؤں اس جانب بڑھ گئے۔ اس کمرے میں ایک بوڑھا سا شخص پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں چھت پر لگیں ہوئی تھیں، یوں لگ رہا تھا کہ یہ مر گیا ہے یا پھر بس مرنے ہی والا ہے۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر تیزی سے نیچے کی طرف چلے گئے۔ سیڑھیاں کھلے آنگن میں اتریں۔ جس کے تین طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ سامنے کے دروازوں میں سے جو دائیں جانب والا ہے، اس کے اندر جا کر مندر رنگھ کا کمرہ تھا۔ وہ دبے پاؤں اندر چلے گئے۔ ہر کمرے میں کوئی نہ کوئی سو رہا تھا۔ مندر رنگھ کی تصویر انہوں نے دیکھ لی تھی۔ اس میں خاص بات یہ تھی کہ اس کی مونچھیں نوکیلی اور اوپر کو اٹھی ہوئیں تھیں۔ بیڈ پر لیٹا ہوا وہی تھا۔ ہلکی روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں دبے پاؤں اس کے سرہانے جا کھڑے ہوئے۔ ایک نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ جاگ گیا۔ اس نے صورت حال سمجھی تو ہڑبڑا گیا۔ تبھی ایک نے اس کے کان میں ہولے سے کہا۔

”چپ چاپ تجوری کی چابیاں دے دو، تعاون کرو گے تو کچھ نہیں کہیں گے ورنہ......“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو دوسرے نے ایک لمبی کرپان اس کی گردن پر رکھ دی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں ابل کر باہر آگئیں۔ اس نے سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے نے دراز کھولی، اس میں چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔

”تجوری والی چابی نکالو۔“ دوسرے نے بڑے سکون سے کہا تو وہ چابی تلاش کرنے لگا۔ اس نے ایک چابی نکالی اور گچھا ان کے حوالے کر دیا۔ پہلے نے کرپان اس کی گردن پر رکھی اور دوسرے نے تجوری کھول لی۔ اس کے ہاتھ میں جتنا مال آیا اس نے لیا اور ایک تھیلی میں ڈال لیا۔

”تیری بیوی کہاں ہے؟“ پہلے نے پوچھا۔ اس نے باہر کی جانب اشارہ کیا تو پہلا ہی بولا۔

”چلو پھر ہمیں باہر تک چھوڑ کر آؤ۔ اس وقت تک نہیں ماریں گے جب تک تم......“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اس کی بیوی اندر آگئی۔ پہلے تو اسے پتہ نہ چلا کہ اندر دو لوگ بھی ہیں، اس سے پہلے کہ وہ چیخ مارتی، دوسرا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کی بیوی پر جا پڑا اور اس کی گردن دبوچ کر بولا۔

”خاموش، آواز نہیں نکالنی۔“

”چلو دونوں باہر۔“ پہلے نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔

وہ چاروں بڑی خاموشی سے حویلی کے گیٹ پر آئے۔ انہوں نے گیٹ کا تالا کھولا، تبھی پہلے نے کرپان سے ایک زوردار وار کیا اور مندر سنگھ کی گردن اُتر گئی۔ اس کی بیوی کے منہ سے چیخ نکلی۔ تب تک دوسرے نے اُس کا سر زور سے گیٹ میں مارا، وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ انہوں نے باہر گلی میں جھانکا، کوئی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے نکلے اور موٹر سائیکل تک جا پہنچے۔ انہوں نے وہ اٹھائی اور وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ ان کا رخ شہر سے باہر جانے والے راستے پر تھا۔

جسپال سنگھ کو رپورٹ مل گئی تھی کہ کام ہو گیا ہے۔ وہ دونوں ابھی تک بٹالہ کے مضافات میں موجود ایک گاؤں میں تھے۔ وہاں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دو دن بعد وہاں سے جائیں گے۔ جس کے پاس وہ ٹھہرے تھے، وہ بھی خالصہ کا سرگرم رکن تھا۔ وہ دونوں سو گئے تھے، لیکن ٹی وی چیخ رہا تھا۔ اس پر یہی بات سب سے اہم بتائی جا رہی تھی کہ مندر سنگھ کی بیوی کے مطابق وہ دونوں ڈکیت سکھ تھے، ان کا مقصد ڈکیتی نہیں تھا، کرپان سے قتل کرنے کا مطلب یہ بتا دینا تھا کہ وہ شدت پسند سکھ ہیں۔ ان کا کوئی دوسرا مقصد تھا۔ جسپال مسکرا دیا۔ اس کا پیغام ”را“ تک پہنچ چکا تھا۔

☆......☆......☆

وہ بڑی روشن صبح تھی۔ میں حویلی سے نکلا اور مسافر شاہ کے تھڑے پر آ گیا۔ اس دن مجھے اروند نے فرمائش کی کہ وہ بھی وہاں جانا چاہتا ہے۔ میں نے نہیم اور مہوش کو بھی ساتھ لیا اور مسافر شاہ کے تھڑے پر جا پہنچے۔ بڑے دنوں بعد وہ کھلی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ میں درختوں کی چھاؤں میں چارپائی پر جا بیٹھا تو وہ تینوں ادھر اُدھر سیر کرنے کے لیے نکل پڑے۔ درویش اور فرید ان کی ضیافت کے اہتمام میں لگ گئے اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

گاڈ فادر کے ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ ایک

باب ختم ہو گیا تھا لیکن ابھی اس کا پھیلایا ہوا گند ویسا ہی موجود تھا۔ اس نے اپنے اردگرد جو چند لوگوں کا حصار بنایا ہوا تھا، وہ اس وقت میرے قبضے میں تھے۔ جب تک وہ ختم نہ ہوتے، اس وقت تک یہ باب بند ہونے والا نہیں تھا۔ وہ سب جنید کے پاس سیف ہاؤس میں تھے۔ اس نے ان تین دنوں میں ان کے سارے اکاؤنٹ خالی کر لیے تھے۔ اب ان کے رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں تھا۔ یہی بات کہنے کے لیے میں نے جنید کو فون کیا۔ وہ وہیں سیف ہاؤس ہی میں تھا۔

''ان سب لوگوں کو طارق نذیر کے حوالے کرو، وہ ان سے مزید تفتیش کر لیں گے، تم چاہو تو نورنگر آ جاؤ۔''

''وہ تو ہو جائے گا، اب ان کے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں، لیکن ان سے ایک بات پتہ چلی ہے، وہ بہت زیادہ خطرناک ہے۔'' جنید نے تشویش سے بتایا۔

''وہ کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے پوری بات کا نہیں پتہ، لیکن اتنا معلوم ہوا ہے کہ یہاں کا ایک سیاست دان ہے، اس کے ذریعے 'را' پاکستان میں دہشت گردی کے لیے ایک گروپ تیار کر رہا ہے، اب وہ سیاست دان مہرہ ہے یا وہی اسے منظم کرے گا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن انہوں نے پبلک مقامات کو نشانہ بنانا ہے، ظاہر ہے اس کا نشانہ بننے والے بچے، بوڑھے، عورتیں اور جوان سبھی ہوں گے۔'' جنید نے کہا تو میں نے پوچھا۔

''اس سیاست دان کے نام کا کچھ پتہ چلا؟''

''نہیں، ظاہر ہے وہ کوئی دوسرے درجے کا سیاست دان ہو گا، کوئی ناکام سیاست دان یا پھر......'' وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''تمہیں یہ بات کس انداز میں بتائی گئی ہے؟''

''میں نے ان کی باتوں سے اخذ کیا ہے۔'' وہ بولا۔

''ممکن ہے کوئی غلط ٹریک دے رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بات سچ ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے تم نے اس کے بارے میں بہت کرید کی ہو گی۔ خیر، تم اسے چھوڑو اور یہ سب لوگ ان کے حوالے کر دو، وہ بھی تلاش کر لیتے ہیں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سوچنے لگا، ایسا ممکن نہیں تھا کہ وہ ملک کی سیکورٹی اداروں سے یہ راز چھپ سکے۔ اتنا ہی اہم پلان تھا تو اس قدر لوگوں کو نہیں بتایا جا سکتا تھا۔ یہ ایک پوری تنظیم کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ کوئی بھی تنظیم ان سیکورٹی اداروں کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکتی تھی۔ ایسے لوگ اتنے کھل کر سامنے نہیں آ سکتے، ان کے پیچھے تو بہت خفیہ ہاتھ ہوتے ہیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ میرا اسیل فون بج اٹھا۔ وہ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے کال رسیو کی تو دوسری طرف سے میرا نام تصدیق کرنے کے بعد کہا گیا

''راشد کو تو نے مروا دیا، میں تمہاری ہمت اور رسائی کی داد دیتا ہوں، ڈیورا بے چاری اب زندہ نہیں ہے، وہ اپنے باتھ روم میں مردہ پائی گئی ہے۔ ظاہر ہے اس نے کہیں بھی جانا تھا، چلی گئی اس دنیا سے۔ یہ ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ تم اتنے احمق بھی ہو سکتے ہو، تم نے راشد کو مار دیا تو سمجھا کہ ہم ختم ہو جائیں گے، نہیں ایسا نہیں ہے، ہم خود اسے مروانا چاہتے تھے، وہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا تھا، اس پر پرسکون زندگی کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔'' اس نے اسی سکون سے کہا تو میں نے پھر پوچھا۔

''میں پھر پوچھتا ہوں کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''دیکھو پرندے ہوا میں اُڑتے ہوئے اچھے لگتے ہیں، وہ جہاں دانہ دیکھتے ہیں، وہیں بیٹھ کر چگ لیتے ہیں، پھر فضا میں اُڑ جاتے ہیں۔ انہیں پنجرے میں قید نہیں کرتے۔'' اس نے سمجھانے والے لہجے میں کہا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''یہی کہ پرندے آزاد کر دو۔ میں اسے تمہاری دوستی تصور کروں گا، اپنا راستہ ہمیشہ الگ رکھوں گا۔ ورنہ پھر میرا پہلا نا سک تمہی ہو۔'' اس کے لہجے میں کافی حد تک تکبر چھلک رہا تھا۔

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو......'' میں نے کہا۔

''تو میں سمجھوں گا کہ تم دنیا کے سب سے بڑے احمق ہو، جسے دوستی کرنا نہیں آتی۔'' اس نے کافی حد تک چڑتے ہوئے کہا تو میں استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''میں خوب جانتا ہوں کہ دوستی اور دشمنی کیا ہوتی ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دوست اور دشمن کون ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے سبق مت پڑھاؤ، کام کی بات کرو۔''

''میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا اور نہ ہی مجھے آنا چاہئے، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ پرندے اُڑا دو، یہی خیر سگالی کا پیغام ہوگا، اور بس۔'' اس نے کافی حد تک نرم لہجے میں کہا تو میں افسوس زدہ لہجے میں بولا۔

''تم نے ذرا سی دیر کر دی، میں ان کے لیے فیصلہ کر چکا ہوں، اب میں فیصلہ واپس نہیں لوں گا۔''

''او کے۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں چند لمحے فون کو دیکھتا رہا، پھر واپس جیب میں رکھ لیا۔

میں جانتا تھا کہ وہ سب مہرے ہی ہیں۔ انہیں چھوڑ دینے سے کوئی فرق بھی نہیں پڑنے والا تھا اور اب اس سے زیادہ ان سے کوئی اہم بات بھی نہیں نکلنی تھی لیکن وہ سب شیطانی ٹولہ کے افراد تھے، ان کا زندہ رہنا ہی نہیں بنتا تھا۔ میں ان کے بارے میں اس وقت تک سوچتا رہا، جب تک مہوش، اروند اور فہیم واپس نہیں آ گئے۔

''یہاں میلہ لگتا تھا؟'' مہوش نے سامنے والی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، ہر سال لگتا ہے، بس دو تین برس درمیان میں نہیں لگا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرے خیال میں ابھی دو چار مہینے رہتے ہیں۔'' میں نے اسے جواب دیا

''پتہ نہیں تب تک ہم یہاں ہوں گے کہ نہیں۔'' اس نے حسرت سے کہا۔

''ہوں گے تو دیکھ لینا، نہیں ہوں گے تو نہ سہی۔'' فہیم نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ تبھی درویش نے دور ہی سے اونچی آواز میں کہا

''اوغم کیوں کرتی ہے بیٹی، ہم آج رات ہی میلہ لگا دیتے ہیں، آپ آ جاؤ رات کو۔''

''وہ کیسے؟'' مہوش نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ گانے بجانے والے بلا لیں گے، کچھ کھیل تماشے والے، کھانا پینا ہم تیار کر لیں گے۔'' اس نے سادگی سے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔ جبکہ درویش ایک طرف نکل گیا، وہ ابھی کھانا بنانے میں مصروف تھا۔

''نہیں بابا جی اصل مزہ تو اسی میلے کا آئے گا نا جو اصل میں لگتا ہے۔'' اس نے کہا تو میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''چل وعدہ رہا، اگر یہاں ہوئے تو ٹھیک، تم دنیا کے جس کونے میں بھی ہوئی، تجھے یہاں بلا لیں گے۔''

"یہ ہوئی نا بات۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو ایک دم سے اروند سنگھ بولا۔

"وہ رام لعل جوگی اور اس کا کیمسٹ بیٹا، ادھر ہی ملا تھا نا، یہیں رہتے رہے ہیں؟"

"ہاں، لیکن وہ دونوں تمہیں اچانک کیوں یاد آ گئے؟" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ سندیپ کور والا انسٹیٹیوٹ ابھی تک ختم نہیں ہوا، وہ ویسے کا ویسا چل رہا ہے۔"

"ہاں اسے ختم تو کرنا ہے، لیکن حالات ایسے بنتے گئے کہ اس طرف سوچ ہی نہ سکے۔" میں نے اعتراف کیا تو وہ بولا۔

"دراصل جسپال سنگھ کے اردگرد ڈورتیں زیادہ ہو گئی ہیں، میرے خیال میں اسے کوئی سدھ بدھ نہیں آ رہی ہے۔ خیر میں نے ایک پلان کیا ہے، اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ بہت شاندار نکلے گا۔"

"بولو، کیا پلان ہے؟" میں نے پوچھا۔

"امرتسر میں تین بندے ہیں، جو اصل میں اس انسٹیٹیوٹ کو چلا رہے ہیں۔ اصل میں وہ بندے نہیں، تین عہدے ہیں، ان پر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، جیسے کہ کچھ عرصہ پہلے ہرنیت سنگھ کو جسپال نے مارا تھا، اب اس کی جگہ نیا بندہ آ گیا ہے؟" اروند سنگھ کہتے ہوئے سانس لینے کو رکا تو فہیم تیزی سے غصے میں بولا۔

"یار یہ تیری بڑی گندی عادت ہے۔ کہانی گھڑنے بیٹھ جاتا ہے، سیدھی بات بتا۔"

"میں بات ختم کر لوں، پھر کہنا، ابھی خاموش بیٹھ۔" اروند نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے میری طرف دیکھا تو اپنے میں مہوش بولی۔

"نہیں تم کہو، ہم شام تک یہیں بیٹھے ہیں۔"

وہ اس طنز کو سمجھ تو گیا لیکن کوئی تبصرہ کیے بنا بولا۔

"انسٹیٹیوٹ تباہ ہوتا ہے یا نہیں، ہم اس پر حملہ کرتے ہیں، وہ ختم ہو جاتا ہے، وہ اسے دوبارہ بنا لیں گے لیکن ہم اسے مستقل بند کروانا چاہتے ہیں تو میرے پلان کے مطابق دو فائدے ہوں گے۔"

"کون سے؟" میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

"ایک تو یہ کہ 'را' پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی، انہیں مجبور کر دیا جائے کہ وہ یہ انسٹیٹیوٹ بند کر دیں۔"

"یہ دھاک کس طرح بٹھانی ہے؟" مہوش نے ہاتھ کو گھماتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا۔

"یہی میرا پلان ہے۔"

"بولو۔" میں نے کہا۔

"وہ تینوں عہدوں پر مامور لوگ ایک ساتھ ختم کیے جائیں اور باہر کے دو تین لوگ۔ جو انتہائی اہم ہیں را کے انہیں ختم کر دیا جائے تو ہم اپنی بات منوا سکتے ہیں، پچھلے تین بندے بھی اپنے کھاتے میں ڈال لیں۔" اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

"اس سب کو آرگنائز کرنے میں تو وقت لگے گا نا؟ تم اسے دیکھو، اور پھر جیسے ہی وقت آئے مجھے بتا دینا۔"

"یہی تو بتا رہا ہوں، میں نے ایک نیٹ کی دنیا میں ایک جعلی تنظیم بنائی ہوئی ہے۔ اس سے میں کچھ لوگوں کو دھمکیاں دیتا ہوں۔ وہی جو غلط قسم کے سرمایہ دار، دولت والے ہیں۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے بتایا تو فہیم نے ہنستے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"کیا دھمکیاں دیتے ہو؟"

"یہی کہ میرے لیے چاکلیٹ بھیجو، میری شرٹ پھٹ گئی ہے، وہ لے دو ورنہ میں تمہارا پاجامہ پھاڑ دوں گا۔ یہ کہ......" مہوش نے ہنستے ہوئے کہنا چاہا تو وہ غصہ کیے بغیر بولا۔

"یہ کہ کوئی بیمار ہے، اس تک رقم پہنچا دو، یتیم خانوں کو، اسپتالوں کو، بے گھر عورتوں کو مطلب جو

بھی مجھے ضرورت مند ملائیٹ پر میں نے اس کی مدد کروادی۔"

"یہ تو شاندار بات ہے یار" مہوش نے تالی بجاتے ہوئے کہا تو فہیم بھی اس کی طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"اچھا اب کہو، ہم نہیں بولیں گے۔"

"میں جھانکتا رہتا ہوں نیٹ پر مختلف لوگوں کے اکاؤنٹ وغیرہ۔ جب سندیپ کور کے انسٹیٹیوٹ کی بابت سنا اور پھر اس پر کچھ نہیں ہوا تو میں نے اسے بھی دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے ساری کہانی سمجھ میں آ گئی۔ ان کی ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ لوگ وہاں موجود لڑکیوں کا جنسی استحصال بھی کرتے ہیں۔ کل شام ان کی ایک پارٹی ہے اور یہ پارٹی انہوں نے اس انسٹیٹیوٹ سے دور رکھی ہے، یہ ان تینوں کو پتہ ہے، یا مجھے معلوم ہے۔ کیونکہ میں ان کی باتیں پڑھ چکا ہوں۔ وہ اپنے ساتھ لڑکیاں لیں گے، جنہیں بالکل پتہ نہیں ہوگا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ وہ وہاں جائیں گے اور......" وہ کہتے ہوئے خاموش ہوگیا

"یہ تم نے بڑی خبر دی ہے اروند سنگھ۔" میں چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کل شام، ابھی کافی وقت پڑا ہے۔" اروند نے بات سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر یہ کام کرنا ہے تو ہوسکتا ہے۔

"اس سے بھی اہم بات میرے ذہن میں آئی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" اس نے پوچھا۔

"یار کیوں نہ ہم اسے ایک تنظیم ہی بنا دیں۔ جس کا تہلکہ مچ جائے۔" میں نے کہا۔

"یہ ممکن ہے اور اسے ہم اس نہج پر چلا سکتے ہیں لیکن اس میں ایک بات بہر حال سامنے آئے گی اور وہ یہ ہے کہ سب لوگ صرف مذہب کے لیے کام نہیں کرتے، بہت کم ہوتے ہیں سر پھرے، اس کے لیے فنڈ اور دولت چاہئے ہوگی اور......" اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سمجھایا

"دولت کی فکر مت کرو، تمہیں پتہ ہے کہ اس وقت بلین ڈالر ہمارے پاس ہیں، ہاں یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ ان لوگوں کو بھی استعمال کیا جائے، جو بہر حال دولت کے لیے سب کرتے ہیں۔ خیر یہ انسٹیٹیوٹ والا معاملہ دیکھو، پھر اسے پوری طرح منظم کرتے ہیں۔"

"اوکے ڈن ہو گیا، ہم اس پر آج ہی سے کام کرتے ہیں۔" اروند سنگھ نے کہا۔

"اچھا، یہ درویش کا کھانا کھاتے ہیں تو اسی پر کام کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور پھر اسی موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ بہت کچھ ہم نے وہیں بیٹھے طے کر لیا۔

☆......☆......☆

امرتسر شہر سے شمال مشرق کی جانب تقریباً پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک شاندار فارم ہاؤس تھا۔ سورج مغرب میں ڈوب چکا تھا۔ ابھی تک وہاں پر مہمان تو کیا میزبان بھی نہیں آیا تھا۔ وہاں سیکورٹی کے چند لوگ تھے۔ یا پھر وہ لوگ جو کھانا وغیرہ تیار کر رہے تھے اور اس وقت اپنے کام سے فارغ ہو کر وہاں سے جانے والے تھے۔ دو تین لوگ وہاں رہ گئے تھے۔ جنہوں نے کھانا وغیرہ سرو کرنا تھا۔ یہ اسی فارم ہاؤس کے ہی ملازم تھے۔ وہ سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ انہیں بالکل بھی یہ خبر نہیں تھی کہ سہ پہر سے ان کی ریکی ہو رہی ہے۔ چند لوگ انہیں دیکھ رہے ہیں، فارم ہاؤس کی لوکیشن سمجھ چکے ہیں۔ وہ چھ تھے اور اسلحہ کے ساتھ پوری طرح لیس

تھے۔ وہ اسی انتظار میں تھے کہ وہ کب آتے ہیں اور یہ اپنا کام کر کے وہاں سے نکل جائیں۔ انہوں نے وہاں سے نکلنے کے لیے پورا بندوبست کرلیا ہوا تھا۔

اس وقت جسپال سنگھ ان سے پوری طرح رابطے میں تھا۔ اس نے سردار رتن دیپ سے مدد تو کیا انہیں بتایا تک نہیں تھا کہ امرتسر کے نواح میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ چھ لوگ پنجاب کے مختلف شہروں سے جمع ہوئے تھے۔ دوپہر کے وقت وہ دربار صاحب پر ایک دوسرے سے ملے اور انہوں نے اس کا پلان کرلیا تھا۔

پارٹی کا بندوبست فارم ہاؤس کی رہائشی عمارت سے ذرا فاصلے پر ایک لان میں کیا تھا۔ وہاں میزیں لگا دی گئی تھیں۔ ضروری سامان رکھ دیا گیا تھا۔ ہلکا ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ دھیمی روشنی تھی۔ کافی حد تک کیف آور ماحول بنا دیا گیا تھا۔ سورج ڈوبتے ہی سب سے پہلے میزبان ہی کی گاڑی اس فارم ہاؤس میں داخل ہوئی۔ وہ اکیلا ہی تھا اور وہ آتے ہی سارے انتظامات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کچھ دیر وہاں رہا اور پھر اندر چلا گیا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں وہاں دو گاڑیاں آگئیں، اس میں سے تین مرد اور چار نوجوان لڑکیاں باہر نکلیں۔ ان لڑکیوں نے بہت شوخ، مختصر اور بھڑکیلا لباس پہنا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ وہ ہنستے، قہقہے لگاتے ہوئے رہائشی عمارت کے اندر چلے گئے۔ وہ کچھ دیر اندر رہے، پھر سبھی باہر آ گئے۔ ان کا رخ اسی لان کی طرف تھا، جہاں میزیں اور کرسیاں لگی ہوئیں تھیں۔ ان کے بیٹھتے ہی میوزک کی آواز کچھ زیادہ ہو گئی۔ وہ سیدھے اس میز کی جانب بڑھے جہاں شراب کی مختلف برانڈ کی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہیں جام دھرے ہوئے تھے۔ ہر کسی نے اپنی پسند کی شراب سے جام بھرا اور ٹہلنے والے انداز میں بکھر گئے۔ یہ بڑے صبر آزما لمحات تھے۔

ان کی نگرانی کرنے والے چھ لوگ فارم ہاؤس کے اندر آ چکے تھے۔ یہاں پر ان کا اندازہ کچھ غلط ہو گیا تھا۔ ان کے گمان میں تھا کہ وہ سب ایک جگہ بیٹھ جائیں گے تو ان پر حملہ کیا جائے گا لیکن وہ جوڑے جوڑے کی صورت میں بکھر گئے تھے۔ اب انتظار کے سوا چارہ نہیں تھا۔ سو وہ اپنی اپنی جگہ دب کر بیٹھے ہوئے تھے۔ لان میں پھرتے ہوئے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ موت ان کے کس قدر قریب پہنچ چکی ہے۔

آدھا گھنٹہ اسی انتظار میں گزر گیا۔ وہ لوگ سرور میں آ چکے تھے۔ ممکن ہے وہ ٹہلتے ہوئے تھک بھی گئے ہوں، اس لیے ایک کے بعد ایک جوڑا آ کر اس میز کے گرد بیٹھنے لگا۔ جیسے ہی سب بیٹھ گئے۔ میزبان نے کھانا لگانے کا اشارہ کر دیا۔ ملازم شاید اسی انتظار میں تھے۔ وہ کھانا لگانے لگے۔ دس منٹ کے اندر کھانا لگ گیا۔ جیسے ہی انہوں نے کھانا شروع کیا۔ ملازم وہاں سے ہٹ گئے۔ ایسے میں وہ چھ کے چھ اچانک نکلے۔ لان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس وقت پتہ چلا جب وہ ان کے سر پر پہنچ گئے۔ تبھی انہیں میں سے ایک نے اٹھ کر اونچی آواز میں للکارتے ہوئے کہا۔

''کون ہو تم لوگ؟''

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے، ایک برسٹ اس پر پڑا، جو اس کے سینے سے لے کر اس کے چہرے تک میں سوراخ کر گیا۔ فائرنگ کی آواز نے ماحول کو ہلا کر رکھ دیا تھا، چیخوں کی آوازوں سے وہاں ہلچل مچ گئی۔

(ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ ماہ)